ششماہی

استشراق

اکتوبر2022۔مارچ2023

مدیر

ڈاکٹر حافظ سعید احمد

Institute Of Orientalism, Mianwal

ششماہی "استشراق"

اکتوبر2022۔مارچ2023

جلد1۔ شمارہ1

مدیر	ڈاکٹر سعید احمد
نائب مدیر	ڈاکٹر محمد عرفان
معاون مدیر	طوبیٰ گل
معاون مدیر	ڈاکٹر محمد بلال دانش
معاون مدیر (انگریزی حصہ)	فرخندہ عزیز اعوان
قانونی معاون	مہوش اسماء اعوان

ادارتی بورڈ

ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری	سابق وائس چانسلر یونیورسٹی آف سرگودھا
ڈاکٹر قبلہ ایاز	سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل / جج شریعت ایپلٹ بنچ
ڈاکٹر عبد اللہ صالح	سابق ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب لاہور
نگار سجاد ظہیر	سابقہ صدر شعبہ تاریخ جامعہ کراچی
ڈاکٹر عمار خان ناصر	معروف مذہبی اسکالر
محمد دین جوہر	معروف اسکالر

ڈاکٹر حافظ محمد نعیم	شعبہ علوم اسلامیہ جی سی یونیورسٹی لاہور
ڈاکٹر فیروز الدین شاہ کھگہ	پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ سرگودھا یونیورسٹی
ڈاکٹر جمیل احمد نتکانی	ایسوسی ایٹ پروفیسر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان
ڈاکٹر عبد الرؤف	ڈائریکٹر نائل انسٹیٹیوٹ آف لینگویجز اینڈ لرننگ، قاہرہ مصر

مجلہ :ششماہی مجلہ استشراق

جلد:1

شمارہ:1

اشاعت :اکتوبر2022۔مارچ2023

ناشر :انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹلزم، میانوالی

مدیر :ڈاکٹر سعید احمد

اشاعت کی نوعیت : آن لائن اشاعت

مقام اشاعت: میانوالی، پاکستان

ویب سائٹ:www.ioorientlaism.org

ای میل :ioorientalism.gmail.com

فہرست

عنوانات	مضمون نگار	صفحہ نمبر
اداریہ	مدیر	5
نکلسن کی کتاب کا تعارف	ڈاکٹر محمد عرفان	9
وائل حلاق کا تعارف	ڈاکٹر حافظ سعید احمد	24
ترجمہ کی روایت	ابو سجل	47
امریکی استشراق کا اجمالی تعارف	طوبیٰ گل	51
نقد و تعارف		
تحریک تجدد و متجددین	ادارہ	60

اداریہ

دنیاعالمی گاؤں کاروپ اختیار کر گئی ہے، اس میں مسلمانوں کی کیاپوزیشن ہے؟ کیا مسلمان دفاعی پوزیشن پر ہیں یا اقدامی پر؟ کیا غیر اقوام سے مکالمہ ضروری ہے یا ٹکراؤ؟ کیا مغربی اقوام مسلم سماج کا مطالعہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کرتی ہیں یامعاشی طور پر گرفت حاصل کرنے کے لیے؟ کیا مسلم سماج کی اپنی کوئی شناخت ہے یاوہ اس سے محروم ہو چکا ہے؟ مسلمانوں کی تاریخ ظلم و ستم سے لبریز ہے یااس میں کوئی عفوودر گزر کا کوئی پہلو بھی موجود ہے؟ کیا مسلمان سیاسی طور پر غلبہ حاصل کیے بغیر باوقار زندگی بسر کر سکتے ہیں؟ یا معاشی طاقتوری ضروری ہے؟ کیا مسلمانوں کا مذہبی ادب جمود کا شکار ہو گیا ہے؟ جہاد اور اجتہاد کے بغیر مسلمان روحانی اور مادی ترقی حاصل کر سکتے ہیں؟ مسلمان معاشروں کو قانونی پہلو سے تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟ کیا قرآن مجید اور حدیث پر نئے سرے سے غوروفکر کی ضرورت ہے تاکہ مسلمان معاشرے دنیا کے ساتھ علمی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی طور پر قدم ملا کر چل سکیں؟ کیا مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ میں آج کے جدید دور کے مسائل حل کا کوئی سراغ ملتا ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جو مسلم دنیا کے قدیم اور جدید اسکالرز کو درپیش ہیں اوران کے جوابات تلاش کرنے کے لیے وہ مصروفِ کار ہیں، ان کی علمی سرگرمی اسی دائرہ کار کے اردگرد گھومتی ہے، لیکن یہ سوال کیوں اور کیسے پیدا ہوئے؟ ضروری ہے کہ ان کے پسِ منظر کو جاننے کی کوشش کی جائے۔

مسلم معاشرے میں استشراق کا مطالعہ کس پہلو سے کیاجائے؟ یہ ایک اہم ترین سوال ہے جس کے لیے مسلمان اسکالرز کوشاں رہے، بعض کے خیال میں ایک علمی تحریک ہے، کچھ اس کو مسلم معاشرے کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کرتے ہیں، بعض کے خیال میں یہ معاصر معاشرے کی ایک تعلیمی اور علمی سرگرمی ہے جو انہوں نے اپنے معاصر معاشرے کے مطالعہ کے لیے شروع کی، اس طرح کے دیگر سوالات موجود ہیں، سب سے اہم ترین سوال یہ ہے، کیا تحریک استشراق استعمار کی علمی معاون تھی؟

مغرب استعمار کے روپ میں مشرق میں داخل ہوا تو انہوں نے اس علاقے کی خصوصیات کو مختلف پہلوؤں سے جاننے کی کوشش کی تاکہ ان پر حکمرانی کرنے میں آسانی رہے، بعض اہلِ علم کے بقول تحریکِ استشراق علمی و قلمی معاون کے طور استعماری طاقتوں کو مواد فراہم کرتی رہی۔ بعض تحقیقی نوعیت کے کام خالصتاً علمی بنیادوں پر ہوئے اور بعض رپورٹس، دستاویزات اور معلومات کو استعمار کی مدد کے لیے مرتب کیا گیا۔ بعض ایسا مواد بھی مرتب ہوا جس میں مسلمانوں کی قدیم علمی روایت کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دور میں مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن پر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا گیا کیونکہ ان کی تہذیب کو موت جیسا خطرہ درپیش تھا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جو قوم بقاء کی جنگ لڑنے میں مصروف ہو تو وہ نیا پن پیش کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ اور ان کی تہذیب اور افکار و نظریات کو بھی فرسودہ کہہ کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اس دور میں بھی تحریک استشراق کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے بلکہ مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے سر سید احمد خان (ان کے نظریات سے اختلاف ہونے کے باجود) نے ولیم میور کی کتاب میں پھیلائے گئے پروپیگنڈے کا جواب دیا، اس طرح ان کے بعد سیرۃ النبی ﷺ میں شبلی نعمانی نے استشراق کا سیرت کے بارے میں ایک مکمل خلاصہ بیان کر دیا اور تحریک استشراق کے علمی انداز کو پانچ نکات میں پیش کیا۔

پچھلی صدی کے آغاز میں مغرب میں گولڈ زیہر (م:1921ء) نے مسلم مصادر اور تاریخ پر گہرے وار کرنے شروع کر دیے اور خود مسلم کتابوں میں ایسے مواد کی چھان بین شروع کر دی جس سے مسلمانوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کیا جا سکے اور اس کے کام کو جوزف شاخت (م:1969ء) نے منظم اور مربوط انداز میں نئے روپ میں پیش کیا، ادھر مسلم علمی دنیا میں سے سوائے چند ایک اسکالر کسی نے جواب دینے کی زحمت نہ کی تحریک استشراق کے علمی کام کے جواب میں برصغیر کے مدرسۃ الاصلاح نے ایک کانفرنس کا ہندوستان میں اہتمام کیا جس میں انہوں نے مذکورہ تحریک کے تعارف اور اس پر تنقید کرنے کے لیے دنیا بھر سے مختلف اسکالرز کو علمی مقالات پیش کرنے کے لیے دعوت دی جنہوں نے استشراق پر تنقید کرنے کے لیے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ اس کے بعد کچھ ایسی ہستیاں ابھریں جو اپنی ذات میں ایک ادارہ تھیں۔ ان میں ڈاکٹر حمید اللہؒ، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمیؒ، ڈاکٹر فواد سیزگینؒ اور ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاریؒ جیسے نابغہ روزگار

شامل تھے۔ ان سب کے کام میں نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے دفاعی نوعیت کا علمی کام کیا۔ ان کے کام کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ مغربی علمی دنیا یعنی استشراق کے اعتراضات کے جوابات دیے جائیں۔ تاکہ مسلمان اپنی روایت سے جڑے رہیں اور ان کے قدم ڈگمگا نہ سکیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے کام کو اردو زبان میں بھرپور انداز سے متعارف کروایا جائے تاکہ مسلمان قوم نئے زاویے سے علمی کام کو مرتب کر سکے۔

اب ہم اکیسویں صدی کے ربع اول کے اختتام کی طرف بڑھ رہے ہیں، ہم نے انسٹی ٹیوٹ آف اور ینٹلزم یعنی دارالاستشراق کی بنیاد اس عزم کے ساتھ رکھی ہے کہ ہم مغربی تحقیقات کو اردو دنیا میں متعارف کروانے کی بھرپور سعی کریں گے، اور اس حوالے سے مسلم دنیا میں جو تحقیقات سامنے آرہی ہیں ان کو ترجمہ کی صورت میں مغربی علمی دنیا کے سامنے رکھیں گے تاکہ مسلم معاشرے میں نچلی سطح پر گفت وشنید کا ایک سلسلہ چل نکلے، اس حوالے سے جو مسلم اسکالرز کام کر رہے ہیں، ان کی تحقیقات کو مغرب تک پہنچانے تک دستیاب وسائل کی ممکنہ حد تک کریں گے، اور اس سلسلہ میں ہم ہر حد تک کوشش کریں گے کہ اس مجلے کو گروہی یا مسلکی سے پاک رکھیں گے، جن مسالک یا گروہ کے اسکالرز نے جو کام کیا ہے، ان کے کام کو اپنے رسالے یا ویب سائٹ پر پیش کریں۔ پاکستانی جامعات کی تحقیقات کو اردو زبان یا انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کریں گے اور کسی فرد کی ذاتی یا نجی کاوش کو بھی سامنے لانے کی کوشش کریں گے۔

استشراقی سرگرمیوں کا مطالعہ جدید مسلم طبقے یا تجدد پسند طبقے کا پسندیدہ مضمون ہے، کیا ان کی سرگرمیوں کو مربوط انداز میں پیش کرنے کے لیے شروع کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ استشراقی طبقے کا مطالعہ کرنے کے لیے مسلمانوں کے روایتی طبقے نے بھی بھرپور سعی کی ہے جن میں ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر مصطفی الاعظمی، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری اور ڈاکٹر فواد سیزگین جیسے اسکالرز کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے، اس طبقے کے کام کو متعارف کروانے کے لیے آغاز کیا جارہا ہے

ششماہی "استشراق" اس لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہو گا کہ اس میں استشراق کو بطور ڈسپلن متعارف کروانے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے علاوہ اس بات کا پورا اہتمام ہو گا کہ اس میں استشراقی یا جدیدیت سے متعلقہ مضامین شائع کیے جائیں گے اور دورِ جدید کے اسکالرز یا مستشرقین کے مضامین کے تراجم بھی شائع ہوں گے اور مغرب میں شائع ہونے والی نئی کتب یا اردو میں شائع ہونے والے رسائل یا کتب پر تبصرے اور تعارف بھی شائع ہوں گے۔ اور مغرب میں یا مغربی جامعات میں ہونے والے کام کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے ان کو شائع کیا جائے گا۔ اور ان کے جرائد اور مجلات میں استشراق یا جدیدیت سے متعلقہ مضامین کو بھی اردو زبان میں شائع کریں گے۔ اور ان مضامین کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا جو کسی مستشرق کے کسی موضوع کے تعارف یا نقد کے حوالے سے ہو گا۔

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ پاکستانی معاشرے میں جدیدیت کے موضوع پر تعارف کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے ، مختلف سیمینارز، کانفرنسز اور سپوزیم کا انعقاد ہو چکا ہے، ہم کوشش کریں گے کہ ان کے منتظمین سے ان کی مکمل رپورٹس حاصل کی جائیں اور ان کی تلخیص یا سفارشات کو ششماہی استشراق میں نمایاں جگہ دی جائے۔

ہم گروہی تعصب سے بالاتر ہو کر اس علمی خدمت کو سرانجام دینے کی کوشش کریں گے، استشراق اور جدیدی ت کے معاشروں پر اثرات اور مسلم اہلِ علم کی خدمات کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔ استشراق اور جدیدیت کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے صاحبان علم سے گذارش کی جاتی ہے کہ "استشراق" کے ساتھ جہاں تک ہو سکے قلمی تعاو ن فرمائیں، آپ کا علمی تعاون اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے کہ کن مضامین اور کتب کا ترجمہ کیا جائے اس کے بارے رہ نمائی فرمائیں۔

مذکورہ مجلے میں معروف مستشرق نکلسن کی کتاب کا تعارف دیا جارہا ہے، اسی طرح دوسرا مضامین وائل حلاق کے تعارف کے بارے میں لکھا گیا ہے، اور تیسرا مضامین ترجمہ کی روایت کے تعارف کے موضوع پر لکھا گیا ہے، اور چوتھا م ضمون امریکی استشراق کے تعارف پر مبنی ہے اور نقد و تعارف کے سلسلے میں ایک کتاب کا تعارف دیا گیا ہے۔

نکلسن کی کتاب کا تعارف

(A Literary History of The Arabs)

ڈاکٹر محمد عرفان

اسسٹنٹ پروفیسر (وزٹنگ) جامعہ پنجاب گوجرانوالہ کیمپس

دینِ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے مطالعہ کے لیے مستشرقین کی کاوشوں نے استشراق کو علم کا ایک مخصوص شعبہ بنا دیا۔ انہوں نے اسلامی ادب کے ایک ایسے بڑے حصے کو نکالا جو وقت کے دھندلکوں میں دفن تھا، بہت سی نادر اور نایاب کتب جو شائع نہ ہوئی تھیں، کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا، ان پر حواشی لکھے، بعض کی شرحیں لکھیں، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کیے، جن سے علماء مشرق و مغرب نے بھرپور استفادہ کیا۔ انہوں نے تہذیبوں اور مذاہب کے مطالعہ میں دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی۔ ہمیں مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنی علمی کاوشوں میں بہت ساری من گھڑت باتوں کو بھی داخل کر دیا۔ انہوں نے اس بات کا دعویٰ تو کیا کہ ان کے مطالعہ خالصتاً معروضی بنیادوں پر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ شاید ایک مستشرق بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی تعصبات سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکا ہو۔ خاص طور پر اسلام، قرآن، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور اسلام کے مختلف نظام سے متعلق ان کے مطالعات محض غیر معروضی ہی نہیں بلکہ تعصب کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان کے تعصب میں کمی بیشی ہو لیکن یہ ناممکنات میں سے ہے کہ تعصب ذرا برابر بھی نہ ہو۔

آر-اے نکلسن کے ابتدائی حالات:

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ہوئی، جس کے کثیر الجہتی اسباب تھے، ان میں سیاسی اور معاشی اسباب بھی تھے اور تہذیبی و تمدنی اسباب بھی تھے۔ اس زمانے میں ایسے مستشرق نہیں ملتے جیسے آٹھویں سے اٹھارویں صدی تک تھے۔ اس دورانیے میں بظاہر مستشرقین کے رویے میں سنجیدگی اور حقیقت پسندی نظر آتی ہے، جن کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے۔ مگر حقیقت میں انہوں نے اپنے مقصد کے

پیش نظر اپنے طریقہ کار تبدیل کیااور یہ چیز ان کی تحریروں اور تقریروں میں صاف جھلکتی ہے جو انہوں نے اپنے پیشروؤں سے ورثہ میں حاصل کی ہیں۔ مستشرقین کی ایسی ہی قسم کے مشہور و معروف انگریز مستشرق رینالڈ ایلین نکلسن ہیں جو 18 اگست 1868ء کو انگلینڈ کی ریاست یارکشائر میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام ہینری ایلین نکلسن تھا جو ایک ماہرِ حیوانات ونباتات تھے۔ہینری نے اپنے پیشے سے متعلق 12 کتابیں اور اس سے متعلق مختلف موضوعات پر 167 مضامین لکھے جنہوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ رینالڈ ایلین نکلسن نے اپنی تعلیم ابرڈیین یونیورسٹی (Aberdeen University) سے حاصل کی اور پھر 1877ء میں کیمبرج یونیورسٹی(University of Cambridge) میں داخلہ لیا، جہاں اس نے Indian Languages Tripos کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ایک ممتاز طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مذہب پسند تحریکوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتا رہا۔ نکلسن کے تعلیمی، ادبی و تصنیفی شغف کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہاتھ میں قلم لے کر اس دنیا میں آیا۔

دنیائے استشراق کے بہت بڑے استاد اور مشرقی علوم کے ماہر ای۔جی۔براؤن (E.G.Brown) جو کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے تھے، ان کے ساتھ نکلسن کی پہلی ملاقات 1891ء میں ہوئی، ان سے نکلسن نے فارسی سیکھی اور ان ہی کی صحبت سے اپنے آپ کو علومِ شرقیہ کے لیے وقف کر دیا۔ یہ دونوں مستشرق ایک دوسرے کے ساتھ تیس سال تک وابستہ رہے۔1902ء میں جب براؤن کیمبرج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوے تو نکلسن ان کی جگہ فارسی کے لیکچرار مقرر کر دیے گئے اور 1926ء میں براؤن کی وفات کے بعد ان کی جگہ عربی زبان وادب کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوے اور 1933ء میں 65 سال کی عمر میں مستعفی ہوئے۔ نکلسن اسلامی ادب اور تصوف میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ انگلینڈ اور یورپ میں اسلامی تصوف کے سب سے زیادہ ماہر تصور کیے جاتے ہیں۔ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کا محققانہ مطالعہ کیا اور اپنی تمام عمر صوفیاء کی کتابیں ایڈیٹ کرنے اور تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں اور مقالے لکھنے میں صرف کر دی۔ وہ اپنے زمانے میں تصوف کے موضوع پر انگلستان میں سند تسلیم کیے جاتے تھے اور یورپ میں آپ کی کتب کو اسلامی تصوف سمجھنے میں بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ نکلسن نے اسلامی تصوف کے حوالے سے بہت کام کیا مگر اس کام میں مستشرقانہ رویہ کو چھپانے میں ناکام رہے۔ اسلامی تصوف کو افلاطون اور ارسطو کی فکر کا

خلاصہ تصور کرتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی تصوف حقیقت میں افلاطون اور ارسطو کی فکر کا ہی نتیجہ ہے اور یہ اسی فکر کی جدید ترین شکل ہے۔ نکلسن اس کا برملا اظہار یوں کرتے ہیں:

> The direct influence of Platonism on Moslem thought has been comparatively slight. When the Moslems began to study Greek philosophy, they turned to Aristotle. The genuine writings of Aristotle, however, were not accessible to them. They studied translations of books passing under his name, which were the work of Neo-Platonists, so that what they believed to be Aristotelian doctrine was in fact the philosophy of Plotinus, Proclus, and the later Neo-Platonist school. Indirectly, therefore, Plato has profoundly influenced the intellectual and spiritual development of Islam and may be called, if not the father of Mohammedan mysticism, at any rate its presiding genius.[1]

"افلاطونیت کا مسلم فکر پر براہِ راست اثر نسبتاً کم ہوا۔ جب مسلمانوں نے یونانی فلسفے کو پڑھنا شروع کیا تو انہوں نے اپنی توجہ ارسطو کی طرف موڑ لی۔ تاہم ان کے لیے ارسطو کی اصل تعلیمات تک رسائی ممکن نہیں تھی۔انہوں نے ایسی کتب کے تراجم کا مطالعہ شروع کر دیا جو اس سے منسوب تھیں اور یہ نوافلاطونیوں کا کارنامہ تھا۔ پس جو یہ (مسلمان محققین) ارسطو کی تعلیمات سمجھتے تھے، حقیقت میں

[1] Muhammad Iqbal, Dr. "The Secrets of the Self", tr: R.A.Nicholson, p: 56, The MacMillsn Co. Canada,Toronto.

افلاطون، پر اکلس اور بعد کے جدید افلاطونی فکر تھی۔ تاہم افلاطون (افلاطونی فکر) اسلام کی فکری اور روحانی ترقی میں بالواسطہ بہت زیادہ اثر پذیر ہو چکی تھی اور اگرچہ اسے (افلاطون) اسلامی تصوف کا باپ نہ کہا جائے مگر اسے ہر قیمت پر اس (اسلامی تصوف) کا بانی کہا جا سکتا ہے۔"

اہم کارنامے:

ان کا سب سے اہم کارنامہ کیمبرج یونیورسٹی میں 30 سال تک علومِ شرقیات کو پڑھانا ہے۔ ان تیس سالوں میں انہوں نے فارسی اور عربی زبان و ادب پڑھائے اور بہت سے نامور مستشرقین طلبہ پیدا کیے جنہوں نے نکلسن کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ان کے شاگردوں میں جے۔ اے۔ آربری (J.A. Arberry) سب سے ممتاز ہیں، جنہوں نے اپنے نامور استاد کی پیروی میں تصوف کا مطالعہ جاری رکھا۔ صوفیا کی کتابیں ایڈٹ کیں اور ان کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ تصوف پر مستقل کتابیں اور مقالے بھی لکھے۔ تصوف پر اس کی مشہور کتاب "SUFISM" ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا۔ پروفیسر نکلسن کی ایک بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے بیس سال کی انتہائی محنت سے "مثنوی" مولانا جلال الدین رومی کو مرتب کیا، جسے بہت سے محققین نے صحیح ترین قرار دیا۔ اگرچہ اس سے پہلے مثنوی کئی بار طبع ہو چکی تھی، لیکن وہ اغلاط سے پاک نہ تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مثنوی کا انگریزی میں آٹھ جلدوں میں ترجمہ کیا۔ متن کی تیاری اور اس کے انگریزی میں ترجمے کے دوران انھوں نے ان تمام شروح کو پیش نظر رکھا جو مشرقی اور مغربی زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ یہ کام 1925ء سے 1940ء کے دوران شائع ہوا۔ یہ "مثنوی" پر پہلا انگریزی ترجمہ کے ساتھ تبصرہ تھا۔ نکلسن کے اس کام کی وجہ سے مولانا رومیؒ کا کام پوری دنیا میں متعارف ہوا۔ 1898ء میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی "دیوان شمس تبریز" کے منتخبات کو Selected Poems of Diwan Shamas Tabriz کے نام سے شائع کیا۔ قصائد کا ترجمہ کرنے کے علاوہ نکلسن نے ان پر حواشی بھی لکھے۔ نکلسن کی ایک اور قابل ذکر تصنیف A Literary History of The Arabs ہے جسے عربی ادبیات اور اسلامی تمدن کے طلبہ کے لیے نہایت مفید تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس تصنیف میں فاضل مصنف نے اصل عربی کتابوں کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ مستشرقین کی تحقیقات سے بھی استفادہ کیا تھا۔ نکلسن نے یہ کتاب چالیس سال کی عمر میں لکھی۔

نکلسن نے ابن عربی کے صوفیانہ قصائد کو "ترجمان الاشواق" کے نام سے شائع کیا۔ "تذکرۃ الاولیاء" کی دو جلدیں 1906ء اور 1907ء میں شائع ہوئیں۔ یہ کتاب صوفیا کرام کے حالات پر مشتمل ہے۔ ابو نصر سراج کی کتاب "اللمع فی التصوف" 1914ء میں ایک ضخیم جلد میں شائع ہوئی، جس کے ساتھ فرہنگ اور اشاریے بھی شامل تھے۔ سید علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخشؒ کی "کشف المحجوب" کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو فارسی میں تصوف کی پہلی تصنیف تسلیم کی گئی ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کی "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں "The Secrets of the Self" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی ادب کو عالمی سطح پر متعارف کروانے میں نکلسن نے بہت اہم کردار ادا کیا لیکن چونکہ وہ اسلامی تصوف کی روح سے ہی ناواقف تھے، اس لیے ان کے کام کو بالکل ہی درست تسلیم کر لینا، کسی بھی طرح سے انصاف پر مبنی نہیں ہو سکتا ہے۔ شیخ نذیر حسین لکھتے ہیں:

> "رینالڈ نکلسن (1868-1945) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے استاد تھے، انہیں تصوفِ اسلام سے بڑی دلچسپی تھی۔ منتخبات دیوانِ شمس تبریز، کشف المحجوب (داتا گنج بخشؒ)، اسرارِ خودی (اقبالؒ) اور مثنوی مولانا روم کے انگریزی تراجم ان کے قابلِ ستائش کارنامے ہیں۔"[2]

بہت سے مسلم مفکرین نکلسن کو دوسرے مستشرقین سے ممتاز قرار دیتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے متعلق نرم رویہ رکھتے ہیں۔ نکلسن نے ای۔ ایچ پامر (E.H.Palmer) کے ترجمہ قرآن پر دیباچہ بھی تحریر کیا۔ ڈاکٹر عبد القادر جیلانی لکھتے ہیں:

---

[2] شیخ نذیر حسین، "اسلام اور مستشرقین"، مرتب: سید صباح الدین عبد الرحمن، ج2، ص36، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یو-پی، انڈیا

"آر اے نکلسن نے پامر کے ترجمہ قرآن کا دیباچہ تحریر کیا جس میں اس نے تذکرہ کیا کہ دورِ نبوی ﷺ میں ایسے کئی افراد تھے جنہوں نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے خود اپنی راہ متعین کر لی تھی اور یہ کہ یہ لوگ حنیف کہلاتے تھے۔"[3]

اس دیباچہ میں نکلسن نبی کریم ﷺ کی نبوت کو تسلیم بھی کرتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے:

When by force of circumstances, the prophet in him had grown into the reler and legislator, it was a psychological necessity he should still feel himself to be chosen medium of the divine message.[4]

"جب حالات کے جبر کے تحت، پیغمبر ایک حکمران اور قانون ساز میں ڈھل گئے تو بھی یہ ایک نفسیاتی ضرورت تھی کہ وہ خود کو الہامی پیغامات کا منتخب ذریعہ سمجھتے رہیں۔"

پروفیسر نکلسن نے بہت سے اعزاز پائے، جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

1- برٹش اکیڈمی نے ان کو اپنا فیلو منتخب کیا۔

2- ابرڈین(Aberdeen)یونیورسٹی نے ان کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

شیخ انور الجندی نکلسن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[3] عبد القادر جیلانی، ڈاکٹر، "اسلام، پیغمبرِ اسلام ﷺ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر"، ص160، بیت الحکمت، لاہور، 2010ء

[4] R.A.Nicholson, "Introduction to 'The Quran", Oxford University Press, London.

"نیکلسن نے اس بات پر زور دیا کہ عرب دنیا، یونانی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہے۔ خصوصاً علم کلام میں وہ مکمل طور پر یونانی تہذیب کی خوشہ چین ہے اور نحو و بلاغت میں وہ یونانی کے ساتھ فارسی زبان و تمدن سے بھی متاثر ہے۔"[5]

A Literary History of the Arabs

بیسویں صدی عیسوی میں دنیا کے بدلتے ہوئے معاشرتی اور سیاسی حالات کے پیش نظر مستشرقین نے اپنی مذہبی سرگرمیوں کی ناکامی اور مسلم دنیا میں پائے جانے والی نفرت کے پیش نظر اپنے انداز تبلیغ و تحریر کو تبدیل کیا اور اس صدی کے نصف آخر کے اوائل میں ہی مستشرقین کی طرف ایسی کتب لکھی جانی شروع ہو گئیں جن سے تصادم کی بجائے صلح و امن و آتشی کا پیغام ملتا ہے۔ بین المذاہب ہم آہنگی کی بڑی بڑی بحثوں نے جنم لینا شروع کیا اور بین المذاہب مکالمہ کی بحثیں بھی شروع ہوئیں۔ مائیکل ہارٹ کی۔"The Hundred" میں اس نے نبی کریم ﷺ کو سب سے زیادہ با اثر شخصیت کے طور پر پہلے نمبر دیا۔ اسی طرح منٹگمری واٹ نے "Muhammad at Makkah" اور "Muhammad at Madina" تصنیف کر کے مسلمانوں کے جذبات سے ساتھ ہم آہنگی محبت کا پیغام دیا۔ Muhammad as a Prophet and statesman"" اور "islamic revelation in the modern world" بھی منٹگمری واٹ کی صلح جوئی کی کوششیں ہیں۔ تھامس کارلائل "On heroes and heroship" اور کیرن آرم سٹرانگ کی کتاب "Muhammad Prophet for our time" میں بھی سابقہ اور پیشتر و مستشرقین کے الٹ نبی کریم ﷺ اور اسلام کے حوالے سے بظاہر قدرے مہذب زبان کا استعمال کیا۔ اسی انداز اور پوشیدہ مقاصد کے تسلسل کو آر۔ اے۔ نکلسن نے اپنی کتاب "A Literary History of the Arabs" میں جاری رکھا۔ ان کتب کی ظاہری زبان بہت مہذب اور میٹھی تھی مگر حقیقتاً یہ بھی اسلام کے خلاف اور پیغمبر ﷺ کی عداوت میں لکھی جارہی تھیں اور ان کا مقصد بھی وہی تھا جو اول دور کے مستشرقین کا تھا۔

---

[5] انور الجندی، شیخ، "اسلام اور مستشرقین"، مرتب: سید صباح الدین عبد الرحمن، ج2، ص176

نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عربی(A Literary History of The Arabs)کو آج بھی عربی ادب سمجھنے میں بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔زیر نظر کتاب پچھلی پوری صدی سے بر صغیر کے محققین و علماء کی طرف سے داد تحسین وصول کر رہی ہے اور حتیٰ کہ پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں بطور نصاب کے شامل ہے اور اسلام کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے خواہشمند طلباء کو پڑھائی جا رہی ہے۔اس کتاب کو آر۔اے۔ نکلسن کی سب سے عمدہ تصنیف(master piece)کہا جاتا ہے۔سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> "عالمِ اسلام اور ممالک عربیہ کی علمی کمزوری، پست ہمتی اور بے مائیگی کی یہ کھلی دلیل ہے کہ یہ ممالک ایک طویل زمانہ سے خالص اسلامی موضوعات پر مستشرقین کی کتابوں کو ماخذ و مرجع سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کی یہ محققانہ کتابیں "کتاب مقدس"(Gospel) کی حیثیت رکھتی ہیں، مثال کے طور پر آر۔اے۔ نکلسن کی کتاب A Literary History of The Arabs۔"[6]

اس میں نکلسن نے عربی ادب کی تاریخ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بہت سی ایسی چیزوں کو زیرِ بحث لایا ہے جس کا اس سے پہلے والے مستشرقین نے ذکر نہیں کیا۔ یہ کتاب پہلی دفعہ 1907ء میں T.Fisher Unwin نے شائع کی اور اسی سال بغیر کسی ردوبدل کے یہ کتاب دو مرتبہ مزید شائع ہوئی جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔

باب نمبر ایک میں سبائی اور حمیری دور کا بیان کیا گیا ہے۔

باب نمبر دو میں قدیم عرب اوران کے زعماء کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

باب نمبر تین میں قبل از اسلام کی شاعری، اخلاقیات اور مذاہب کا بیان کیا گیا ہے۔

---

[6] ندوی، ابوالحسن علی، سید، "اسلام اور مستشرقین"، مرتب: سید صباح الدین عبدالرحمن، ج2، ص276-277

باب نمبر چار میں رسولِ مکرم ﷺ اور قرآن پر نکلسن نے دادِ تحسین دی ہے۔

باب نمبر پانچ میں خلفائے راشدین اور خلافتِ بنوامیہ کا بیان کیا گیا ہے۔

باب نمبر چھ میں بغداد کے خلفاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب نمبر سات میں عباسی عہد میں ادب، شاعری اور سائنس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب نمبر آٹھ میں راسخ العقیدگی، فکری آزادی اور صوفی ازم کا بیان کیا گیا ہے۔

باب نمبر نو میں عربوں کی یورپ آمد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب نمبر دس میں منگولوں کی تباہی سے عصرِ حاضر تک عربوں کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب 540 صفحات پر مشتمل ہے۔ تمہیدی گفتگو نکلسن نے چار صفحات میں بیان کی ہے۔ اس کتاب کا تعارف نکلسن نے سترہ صفحات میں کروایا ہے۔

پہلے باب میں خطہ عرب کی سبائی حکومت سے کی گئی ہے۔ سبائی دور کی دو نمایاں قوموں عاد اور ثمود کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور پھر قوم عاد و ثمود کے سرکردہ سربراہاں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسکے بعد حمیری دور حکومت اس کی نمایاں شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے اور حمیریوں کا آپس میں تقابل کیا گیا ہے۔ اس باب میں عرب کا جغرافیہ بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس طرح عربوں کی خصوصیات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ذوالقرنین اور بلقیس کے بعد حمیریوں کا سب سے نمایاں شخص "اسد کامل" کی لوک کہانی بیان کی ہے جو حمیریوں میں بہت زیادہ مشہور تھی۔ یہ وہی اسد تھا جس نے یمن میں یہودیت کی بنیاد ڈالی۔ نکلسن کے مطابق دورِ جاہلیت کے ادب کی معلومات ہم تک درج ذیل ذرائع سے پہنچی ہیں۔

(1) نظم (2) اقوال (3) تاریخی روایات

پہلے دو ابواب میں عرب کے جغرافیہ کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے ارد گرد ریاستوں، ان کے والیان اور اس وقت ان کے مرتبے اور مقام کا بیان کیا گیا ہے۔ ان ریاستوں میں قیام پذیر افراد، ان کا طرزِ حیات، ان کی معیشت، اخلاقیات اور نظامِ سیاست کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نکلسن نے اس وقت کی عظیم طاقت (Super Powers) کی سابقہ حیثیت اور عروج کی لمبی چوڑی کہانیوں کو چند پیرایوں میں سمیٹا ہے۔ نکلسن نے عربوں کی تاریخ کو سبائی اور حمیری دور سے شروع کیا ہے۔ جنوب عرب میں سبائی اور حمیری آباد تھے۔ نکلسن کے مطابق سبائی عربوں پر پہلے حکمران تھے اور یہ عرب میں لمبے عرصے سے ایک بہت بڑی تجارت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ سبائیوں کے بعد حمیری حکومت بر سرِ اقتدار آئی جو پانچویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ سبائی اور حمیری دورِ حکومت کے متعلق معلومات کے ذرائع درج ذیل ہیں۔

(i) حمیری دور کے مدون نسخے (2) مسلمانوں کی طرف سے محفوظ کردہ روایات

نکلسن کے مطابق عربی ادب کے حوالے سے حسن بن احمد الہمدانی کی "الاکلیل" اور نسوان بن سعید الحمیری کی "القصیدۃ الحمیریہ" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ عبید بن شریہ کی "کتاب الملوک واخبار الماضیین" حمزہ اصفہانی نے بھی یمن کے حمیری بادشاہ تبع پر کتاب لکھی۔ یعرب وہ شخص تھا جس نے صبح کے سلام کے لیے "انعم صباحاً" کے الفاظ سے عربوں کو متعارف کروایا۔ سبائی حکومت کے خاتمے پر العاشہ نے جو گیت گایا، اس سے عربی ادب ایک نئے دور میں شروع ہوا۔ تیسرے باب میں قبل از اسلام عربی ادب خصوصاً شاعری پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قبل از اسلام عربی شاعری کی خصوصیات، اس کے مختلف اصناف اور عرب کے مشہور شعراء کے نام اور ان کے کلام کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان شاعروں کی شاعری میں حمیت، شجاعت، وفاداری، مہمان نوازی جیسی قابل قدر خصوصیات کو ابھارا جاتا تھا اور اسی طرح ان میں موجود رذائل اخلاق جیسے عورت کا کمتر ہونا، نومولود کو ماردینا، دشمن کے ساتھ سلوک، خونی انتقام، قبائلی تفاخر کو بھی شاعری کے ذریعے نمایاں کیا جاتا تھا۔ مثلاً ثابت بن جابر بن سفیان کی شاعری کے موضوعات ہی یہ تھے۔ عرب کے وہ مشہور شاعر جن کی شاعری کو کعبہ کے دروازے پر لٹکایا گیا، ان کا حقیقت پسندی سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ نکلسن کا اصل استشراقی روپ وہاں نظر آتا ہے جہاں قرآن اور نبی اسلام ﷺ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے یہاں پر نکلسن موصوف حقیقت پسندی کو چھوڑ کر تعصّب اور عناد کا کھل کر مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ الہامی کتاب جس نے عربی ادب کو

نئی مہذب راہ سے آشکار کیا اور تمام دنیا کے ادیبوں کو چیلنج دیا کہ اگر تم اس جیسا کوئی ادب لا سکتے ہو تو پیش کرو۔ ایسی بے نظیر اور بے مثال کتاب کو نکلسن اپنے تعصب کی بنیاد پر غیر الہامی، انسانی کلام، ادھوری کتاب اور اکتا دینے والی قرار دے کر اپنی غیر متعصبیت کا بھرم توڑ دیا۔ اسی طرح حدیثِ رسول اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرت پر لایعنی اعتراضات لگا کر خود کو متعصب ترین مستشرقین کی صفوں میں لا کھڑا کیا۔ پانچویں باب میں خلفائے راشدین اور اموی دور کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ چھٹے باب میں عباسی دور پر سرسری بحث کی گئی ہے جبکہ ساتویں باب میں عباسی دور کی شاعری، ادب اور اس کی مختلف شاخوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ آٹھویں باب میں اسلامی تصوف پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ نویں باب میں عربی ادب کی اس کیفیت پر بحث کی گئی ہے جب وہ یورپ میں داخل ہوا اور دسویں باب میں منگولوں کے اسلامی ممالک پر حملوں کے بعد سے لے کر موجودہ دور تک کے حالات و واقعات پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کا منہج و اسلوب

نکلسن نے اپنی کتاب میں سادہ، سلیس اور روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے۔ زبان اتنی آسان ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے کسی لغت کی کتاب (Dictionary) کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اندازِ بیان ایسا ہے کہ قارئین کو ان کی باتیں سمجھنے کے لیے ذہنی قلابازیاں نہیں لگانا پڑتیں۔ آپ کا اسلوب تحریر سادہ، واضح اور منطقی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور مطلب ادا کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا احساس نہیں دلاتے۔ اپنی بات کو مزید مدلل بنانے کے لیے اسلام کی اولین کتابوں کے حوالے پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں 128 کتب کو بطور حوالہ استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سے صرف 11 کتابیں مسلمان مصنفین کی ہیں اور ان میں سے بھی 9 کتب کے تراجم مستشرقین نے کیے ہیں۔ گویا اصلی حالت میں صرف دو کتابیں مسلمان مصنفین کی ہیں۔ باقی 126 کتابیں مستشرقین کی تصنیف شدہ یا مترجم شدہ ہیں جس میں گولڈ زیہر، نولڈیکے، آرنلڈ، جوزف شاخت، کریمر اور ولیم میور جیسے متعصب مستشرقین شامل ہیں۔ اب ان کے ہوتے ہوئے کس طرح یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ نکلسن نے اپنی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے؟ اس کے علاوہ نکلسن نے اپنی کتاب میں قرآن پاک کے جو حوالے درج کیے ہیں، ان میں اور قرآن پاک کے اصل حوالوں میں بھی کافی تضاد ہے۔ بعض جگہوں پر تو

قرآن پاک کی سوَر کی آیات میں بھی تضاد وارد کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے جس میں نکلسن کی کتاب میں درج آیت نمبر بمعہ صفحہ نمبر کا تذکرہ کیا جارہا ہے اور اس کے ساتھ ہی صحیح آیت نمبر درج کر دی گئی ہے۔

صفحہ نمبر	سورۃ کا نام	کتاب میں درج آیت	صحیح آیت نمبر
2	ہود	56-57	53-54
3	اعراف	72	73
3	اعراف	76	78
17	الکہف	82-98	83-98
27	البروج	4	8
91	النحل	59-61	57-59
91	الاحزاب	33	31
151	العنکبوت	47	48
163	القارعۃ	1-8	1-11
164	بنی اسرائیل	69	67
166	بنی اسرائیل	90	88
167	بنی اسرائیل	45	47

8-10	7-9	البقرہ	172
39-40	40-41	الحج	174
13	11	آل عمران	174
191	187	البقرۃ	174
193	189	البقرۃ	174
255	256	البقرۃ	176
111	112	التوبۃ	209
38	41	المدثر	223
143	139	الاعراف	397
172	171	الاعراف	398
40	44	النساء	449

آر-اے نکلسن کا تعصب:

گو کہ اس کتاب کو علمائے مشرق و مغرب کی کثیر تعداد نے دادِ تحسین دی ہے مگر اس کے باوجود اس میں جہاں اسلام کا تذکرہ آیا ہے، وہاں مصنف مذکورہ اپنے مذہبی تعصب کو چھپانے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے۔ڈاکٹر بنت الشاملی نکلسن کی اس کتاب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"عربی فن پاروں کو سمجھنے میں ان سے بے شمار غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض سے تو صرف نظر کیا جاسکتا ہے لیکن اکثر غلطیاں وہ ہیں جن سے نکلسن کے مطالعہ وعلم کی بڑی مضحکہ خیز صورت سامنے آتی ہے۔"[7]

نکلسن کے علم وفضل کو ٹھوکر قرآن، حدیث اور سیرت پر جاکر ہی لگی جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے کہ مصنف مذکور کے پیش نظر بھی اسلام دشمنی اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے عناد تھا۔ مصنف مذکور نے حقائق سے چشم پوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پیشرو مستشرقین کی تحقیق کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بجائے اندھی تقلید کا اظہار کیا اور وہی اعتراض قرآن، حدیث اور پیغمبرِ اسلام ﷺ پر لگائے جن کے جوابات مسلمان محققین بارہا مرتبہ دے چکے تھے۔ دنیا کے ادبوں میں سب سے عظیم شاہکار قرآن مجید میں نکلسن کو کمی نظر آئی جبکہ وہ دور جسے زمانہ جاہلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس ادب کی تعریفیں کرتے ہوئے نکلسن موصوف کے الفاظ ختم نہیں ہوتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید نے کھلا چیلنج دے رکھا ہے اور آج تک کسی نے بھی اس چیلنج کو قبول نہیں کیا ہے، اس کے باوجود ایسی عظیم اور بے مثال کتاب پر نکلسن کا اعتراض داخل کرنا انتہائی غیر ذمہ دارانہ فعل ہے اور اس سے نکلسن اور اس جیسے افراد کے غیر متعصب ہونے کی انتہائی مضحکہ خیز صورت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اسی طرح نکلسن نے دورِ جاہلیت کی عربی کے نسخوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن کہیں بھی ایسی چیزیں جو اس شاعری کی تشریح کرتی ہوں، کا تذکرہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا لیکن اس تسلسل کو مصنف مذکور حدیث کے حوالے سے برقرار نہیں رکھ سکا ہے ۔اس نے حدیث پر بھی وہ اعتراض کیے ہیں جو اس کی تصنیف کا مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہنا کہ "یہ روایات محمد ﷺ کے دور میں مدون نہیں تھیں بلکہ بعد کے لوگوں نے اس کی تدوین کی، اس لیے اسے قبول نہیں کیا جاسکتا ہے"۔ نکلسن کا کام محض عربی ادب کا احاطہ کرنا تھا نہ کہ یہ بتانا کہ کس چیز کو قبول کیا جاسکتا ہے اور کس کو رد کیا جاسکتا ہے۔ پھر احادیث کے تمام کے تمام ذخیرہ کو ایک ہی جملے میں یہ کہہ کر جھٹلا دینا کہ "چونکہ محدثین نے اپنے پاس محفوظ ایک بہت بڑے ذخیرہ

---

[7] انور الجندی، شیخ، "اسلام اور مستشرقین"، مرتب: سید صباح الدین عبد الرحمن، ج2، ص177

سے چند ہزار کو اپنی تصنیف میں درج کیا، اس لیے ناقابل قبول ہیں"۔ یہ چیز بھی نکلسن کے غیر متعصب بلکہ محقق ہونے کو بھی مشکوک قرار دیتی ہے۔ ادب کی بات کرتے کرتے نکلسن موصوف ایسی شخصیت کو اپنے ذاتی عناد کا نشانہ بناتا ہے جس نے آکر انسانیت کے اخلاق کو سنوارا اور انسانیت کو کامیابی اور کامرانی کی راہوں سے متعارف کروایا۔ حالانکہ نکلسن کی کتاب کا مقصد عربی ادب کی تاریخ بیان کرنا ہے چہ جائیکہ اپنے تعصب کا اظہار۔

وائل حلاق کا تعارف

ڈاکٹر حافظ سعید احمد

ڈائریکٹر: انسٹی ٹیوٹ آف اور ینٹلزم میانوالی

مستشرقین نے فقہ اور اسلامی قانون کے بارے میں مطالعے کا آغاز اٹھارویں صدی کے اخیر میں کیا۔ پھر منظم اور مربوط مطالعے کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں کیا آغاز میں انتظامی معاملات چلانے کے لیے انہوں نے نے بعض فقہی کتب کا ترجمہ کیا تاکہ ان کے مقرر کردہ سرکاری اہلکاراس سے استفادہ کر سکیں مثال کے طور پر ہملٹنHamilltionنے 1791 میں ھدایہ کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیااور سر ولیم جونز Sir William Jonesنے 1792 میں سراجیہ کا ترجمہ کیااور بیلیBailieکی تحریریں بعد میں آنے والے مستشرقین کے لیے رہنما بنیں۔ اور اسی طرح گولڈ زیہر (م:1921) علمی حلقوں میں ایک معروف نام ہے، استشراقی تحریک میں اس کو نئے دور کا بانی تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے مذہبیات میں مطالعے کے نئے حاصلات پیش کیے جس کی روشنی میں استشراقی تحریک کے اسکالرز نے اسی منہج پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کی کتاب کا انگریزی زبان میں Muslim Studiesکے نام سے ترجمہ ہوا، اس کتاب نے مغرب میں اسلام کے مطالعے کی نئی بنیاد رکھی اور اسی طرح اس کی کتاب کو علمی دنیا میں سنگِ میل کہا جا سکتا ہے اور اس نے اسلامی قانون وفقہ کے میدان میں کتاب Introduction to Islamic Theology and Lawلکھی۔ ڈنکن بلیک میکڈونلڈ) Duncan Black Macdonald(1883۔1943)نے فقہ اسلامی کے حوالے سے درج ذیل کتاب لکھی:

- Development of Muslim Theology, Jurisprudence and Constitutional Theory

نارمن کالڈرNorman Colder(1950۔1958)نے فقہ سے متعلق مندرجہ ذیل کتب لکھیں:

- Studies in Early Muslim Jurisprudence
- Islamic Jurisprudence in the Classical Era
- Interpretation and Jurisprudence in Medieval Islam

اور اسی طرح نول جے کولسن Noel J. Coluson نے بھی فقہ اسلامی پر کام کیا اور مختلف کتابیں لکھیں۔ جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے:

- History of Islamic Law (1964)
- Conflicts and Tension in Islamic Jurisprudence

جوزف شاخت قانون کے حوالے سے علمی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ اس نے اسلامی قانون کے موضوع پر دو کتابیں لکھیں:

- An Introduction to Islamic Law
- Origin of Muhammadan Jurisprudence

اس کے کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے کام کو مغربی دنیا میں قانون کے میدان میں ماخذ کی حیثیت حاصل ہے اور کولسن کا خیال ہے کہ شاخت نے اسلامی قانون کے بارے میں ایسی تحقیق پیش کر دی ہے کہ جس کو چیلنج کرنا ناممکن امر ہے۔ اسلامی قانون اور خاص طور پر اسلامی قانون کے اصولوں کے بارے میں اس کو مستشرقین کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے اسلامی قانون پر جس طرح محققانہ انداز سے بحث کی اس طرح کسی اور مستشرق نے نہیں کی۔ جس نقطہ نظر سے سوچنے کی ابتداء گولڈ زیہر نے کی اور اس کے نتیجے میں مغرب میں جو طرزِ فکر وجود میں آیا، شاخت اس کا سب سے بڑا نمائندہ اور شارح ہے۔ شاخت نے جو تحقیقات پیش کیں ان پر مصطفی الاعظمی اور ظفر اسحاق انصاری وغیرہ نے علمی اسلوب میں رد کیا بلکہ اس کی علمی غلطیوں کو بھی واضح کیا۔ اسی طرح مغربی اسکالرز نے بھی اس کے کام کا بعض پہلوؤں پر نقد بھی کیا ہے ان میں ایک معروف نام وائل حلاق ہے۔

وائل۔بی۔ حلاق (پ: 1955) اسلامی قانون و تاریخ کا اسکالر ہے۔ اس وقت وہ کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ اس نے بی۔اے کا امتحان جارج ٹاؤن یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اور پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری یونیورسٹی آف واشنگٹن سے حاصل کی۔ یونیورسٹی آف واشنگٹن سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد، اس نے 1985 میں میکگل یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کام شروع کر دیا، 1994 میں وہ پروفیسر بن گیا، وہ دنیا بھر میں اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، اس کا کام مختلف زبانوں مثلاََ عربی، انڈونیشین، عبرانی، جاپانی ترکی اور فارسی میں ترجمہ ہو چکا

ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق اس کو 2009 میں باوجود غیر مسلم پسِ منظر ہونے کے پانچ سو مؤثر مسلمانوں میں شمار کیا گیا ہے۔اس رپورٹ میں اس کے بارے میں درج ذیل ریمارکس دیے گئے ہیں:

Hallaq is one of the world's leading authorities on Sunni *fiqh (*jurisprudence). He is a prolific writer, having published over 60 books and articles, and his works are translated into numerous languages, giving him considerable scholarly reach. He is currently completing a large, multi-volume research series for Cambridge University Press called 'The Origins and Evolution of Islamic Law'. He gained notoriety for his work against the notion of closed gates of *ijtihad*(deduction through reasoning).He remains a professor of Islamic Law at McGill University.[8]

وائل حلاق کا تحریر و تحقیق کا میدان اسلامی قانون (سنی پس منظر میں) اور جدیدیت ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں اسلامی قانون کے آغاز وارتقاء، ریاست اور قانون کا باہم تعلق، قدیم عدالتی نظام، اس کے اہلکار، اسلامی قانون پر خارجی اثرات، اس کے مآخذ، مختلف ادوار میں فقہ اسلامی کے ماہرین کی آراء، قانون اسلامی پر استعماری اثرات، جدید ریاستی نظام میں اسلامی قانون کا مقام، بیسویں صدی میں مختلف مسلمان ممالک میں جدید اسکالرز کے کام کا جائزہ، قدیم فقہی تصورات کے نتیجے میں تشکیل دیے جانے والا قانون جدید ریاستی نظام میں جگہ بنانے میں کیوں ناکام ہے؟ موجودہ دور میں اسلامی قانون کو کس طرح مسلمان ممالک میں نافذ کیا جا سکتا ہے، اسلامی قانون کو قابل عمل بنانے کے لیے کن پہلوؤں سے تبدیلیوں کی ضرورت ہے وغیرہ۔ جیسے موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس نے اسلامی قانون کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے ازالے کی بھی کوشش کی۔وہ لکھتا ہے:

This book attempts to correct misconceptions about Islamic law, first by giving a brief account of its long history and then by showing that what happened to it during the last two centuries made it what it has become. While, historically, it did its best to distance itself

[8]The 500 most influential Muslims in the world, 2009, The Prince Al waleed Bin Talal center, Georgetown University, p 98

from politics and to remain an example of the rule of law, it has now ironically become a fertile political arena, and little else in terms of law. The book therefore attempts to provide the knowledge needed to explain why any mention of the Shariʿa provokes distaste and even fear on our part. What brought this about? Was the Shariʿa as harsh and oppressive as it is now depicted in the media? What were its doctrines and practices in history?

How did it function within society and the moral community? Under what conditions did it coexist with the body-politic? How was it colonized and largely dismantled? And, finally, how were its remnants transformed into an oppressive regime, wielded above all by the relatively new nation-state (perhaps the most important factor in Shariʿa's modern transformation)?[9]

یہ کتاب اسلامی قانون کے بارے میں غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کرتی ہے، پہلے اس کی طویل تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا، پھر پچھلی دو صدیوں میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا، اور وہ کیا سے کیا بن گیا ہے جبکہ تاریخی طور پر اس کی پوری کوشش رہی کہ خود کو سیاست سے جدا رکھے اور قانون کی حکمرانی کی مثال بنا رہے۔ اس کو سیاسی رنگ میں رنگ دیا گیا ہے اس میں قانون کا حصہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اسی لیے یہ کتاب اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ کیوں شریعت کے نام سے عدمِ دلچسپی اور خوف ابھر آتا ہے۔ ایسے حالات کیوں پیدا ہوئے؟ کیا شریعت واقعی اتنی وحشیانہ ہے جتنی کہ ذرائع ابلاغ میں بیان کی جاتی ہے۔ تاریخ میں اس کے تصورات اور کردار کیا رہے ہیں؟

اس نے معاشرے اور اخلاقی کمیونٹی میں کیا کردار ادا کیا؟ کن شرائط کے تحت یہ سیاسیات کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا؟ کس طرح یہ استعمار سے متاثر ہوا اور بڑے پیمانے پر ختم ہو کر رہ گیا۔ اور بالآخر کس طرح اس کے بقایاجات ظالمانہ حکومتوں میں داخل ہو گئے۔ مجموعی طور پر اس کو نسبتاً نئی قومی ریاستوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا (شاید جدید پیرائے میں منتقل کرنے کے لیے اہم ترین پہلو ہے)

[9]Wael.B. Hallaq, *An introduction to Islamic law* (Cambridge, UK; New York:Cambridge University Press, 2009, p1.

مستشرقین نے اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی ان میں سب سے اہم اور قابلِ غور پہلو اسلامی قانون کے آغاز وارتقاء کا مطالعہ کرنا ہے بظاہر مقاصد میں قدیم اسلامی قانون کو عہدِ حاضر کی جدید ریاستی نظام میں قابلِ عمل بنانا ہے جبکہ اس کے پسِ پردہ مقاصد میں شکوک شبہات کی تخم ریزی کرنا ہے اور ان کے خیال میں اسلامی قانون کی آغاز پر بات کی جائے کہ اسلامی قانون ابتدائی شکل میں کس حالت میں تھا، کون سے موضوعات زیرِ بحث لائے گئے، اس دور کے مروجہ قوانین سے کس طرح برتاؤ کیا جاتا تھا، دوسری تہذیبوں اور دیگر مذاہب کے قوانین سے کس طرح استفادہ کیا جاتا تھا وغیرہ۔ ان موضوعات پر تحقیق کرنے کا مقصد اسلامی قانون کی ابتدائی حالت کے بارے میں مسلمانوں کی فراہم کردہ معلومات کو چیلنج کیا جائے تاکہ ان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کیا جائے۔ اسلامی قانون کے ارتقائی پہلو پر بات کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلامی قانون کے نام پر جو کچھ رائج ہے وہ بدلتے حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس عہد کے اسکالرز کے نتائجِ فکر ہیں ان کا اسلام سے صرف واجبی تعلق ہے۔

مستشرقین نے آغاز وارتقاء کی بحث کو بیسیوں صدی میں اٹھایا کہ اسلامی قانون پہلی صدی ہجری کے بڑے حصے میں اصطلاحی معنوں میں موجود ہی نہ تھا بلکہ اس کی ابتداء پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اس کی ابتداء ہوئی۔ لیکن وائل حلاق نے مسلم روایتی نظر کو بھی رد کیا ہے کہ اسلامی قانون عہد رسالت میں یا ان کی وفات کے فوراََ بعد شروع ہوا اور اس طرح مستشرقین کے تصور کو بھی مسترد کیا ہے کہ اسلامی قانون ابتدائی شکل میں پہلی صدی ہجری کے اختتام پر سامنے آیا۔ بلکہ وہ درمیانی پوزیشن پر کھڑے ہونے کا دعویدار ہے بلکہ اس نے اسلامی قانون کو ارتقائی پہلو سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

In the case of the first century, I subscribe neither to the traditional view that Islamic Law, as a more or less mature system, began during or immediately after the life time of the Prophet, nor to the relatively recent view which places the rudimentary beginning of this law around the end of the first century of the Hijra (ca.715 A.D.).[10]

---

[10]Wael.B. Hallaq, A history of Islamic legal theories :An Introduction to Sunnīuṣūl al-fiqh ,New York: Cambridge University Press, 1997, p, vii

پہلی صدی ہجری کے معاملے میں، میں نہ تو روایتی نقطہ نظر کی حمایت کرتا ہوں کہ اسلامی قانون کم یا زیادہ بہتر صورت میں پیغمبر کی زندگی ہی میں یا ان کی وفات کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا اور نہ ہی قدرے جدید نقطہ نظر کہ یہ قانون ابتدائی شکل میں پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا۔

اس نے اس تصور کو بھی رد کیا ہے کہ اصولِ فقہ دوسری صدی ہجری کی پیداوار ہیں اور امام شافعی اس کے بانی ہیں۔ بلکہ اس کے خیال میں اسلامی قانون کے اصول یعنی اصولِ فقہ دوسری صدی ہجری کے اختتام پر سامنے آئے اور چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں مکمل صورت میں سامنے آگئے۔ وہ لکھتا ہے:

We shall argue that by the end of the second/eighth century, legal theory had emerged in only a rudimentary form, and that it was not until the beginning of the fourth/tenth century that it reached the final stage of its formation as an integrated methodology[11]

ہم اس نظریے کے حق میں دلائل دیں گے کہ دوسری صدی ہجری کے اختتام تک اصول فقہ ابتدائی شکل میں سامنے آئے تھے اور چوتھی صدی ہجری کے آغاز ہی میں مستحکم منہج کے طور پر اپنے آخری مراحل میں پہنچ گئے تھے۔

قرآن

اسلامی قانون کے ماخذ کے لحاظ سے قرآن مجید کو ہر دور میں ہر لحاظ سے اولیت حاصل رہی ہے جس کی وجہ سے مستشرقین نے اسلام کے مطالعات کے تحت قرآن اور علومِ قرآن پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اس حوالے سے انہوں نے مختلف پہلوؤں سے سوالات، اعتراضات، اشکالات اور شکوک پیدا کیے اس عمل کے پیچھے مقاصد خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ایک بات سامنے آتی ہے کہ قرآن کی تعلیمات نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ وائل حلاق نے اسلامی قانون کی تاریخی ارتقاء پر کام کرتے ہوئے قرآن مجید پر اپنے پیشروؤں کے اعتراضات کو درخور اعتنا سمجھا اور قرآن کے بارے میں اپنے خیالات کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

[11] Ibidp

Whatever the Quran says about an event or an idea during the Prophet's lifetime, I take to be an authentic representation of that event or idea.[12]

قرآن پیغمبر کی زندگی میں ہی نازل ہوا اور یہ ان واقعات اور خیالات کا پرتو ہے جو اس عہد میں واقع ہوئے۔ اسی لیے، قرآن پیغمبر کی زندگی میں جو واقعہ یا خیال پیش کرے، میں ان کو صحیح تسلیم کروں گا۔

اور وہ قانونی معاملات کے بارے میں قرآن مجید کی حیثیت کو ان الفاظ میں واضح کرتا ہے:

Muslim jurists and modern scholars are in agreement that the Quran contains some 500 verses with legal content. In comparison to the overall bulk of Quranic material, the legal verses appear exiguous, giving the erroneous impression that the Quran's concern with legal matters is merely the Quran often repeats itself both thematically and verbatim.[13].

مسلم فقہاء اور اسکالرز اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن میں پانچ سو قانونی نوعیت کی آیات ہیں۔ قرآن کے پورے ذخیرے کا تقابل کیا جائے تو بہت قلیل نوعیت کی آیات قانون سے متعلق ہیں، اس سے بہت غلط تاثر ملتا ہے کہ قانونی معاملات میں قرآن خود اپنی بات کو مکمل اور ہو بہو بیان کرتا ہے۔

While it is true that the Quran is primarily a book of religious and moral prescriptions, there is no doubt that it encompasses pieces of legislation, strictly speaking. In propounding his message, the Prophet plainly wished to break away from pre-Islamic values and institutions, but only insofar as he needed to establish once and for all the fundaments of the new religion. Having been pragmatic, he could not have done away with all the social practices and institutions that prevailed in his time. Among the multitude of exhortations and prescriptions found in the Quran, there are many

[12]A history of Islamic legal theories, p 2
[13] ibid, pp3,4

legal and quasi-legal stipulations. For example, legislation was introduced in select matters of ritual, alms-tax, property and treatment of orphans, inheritance, usury, consumption of alcohol, marriage, divorce, sexual intercourse, adultery, theft, homicide and the like. [14]

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مذہبی اوراخلاقی ہدایات کی بنیادی کتاب ہے ، اس کے پیغام پر غور کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پیغمبر کی واضح طور پر یہ خواہش تھی کہ ایک نئے دین کی بنیاد رکھیں، لیکن عملی لحاظ سے ، اس دور میں مروجہ سماجی رسومات اور اداروں کو ختم نہیں کر سکتے تھے، قرآن میں بہت ساری اخلاقی نوعیت کی تعلیمات ہیں، ان میں بہت سارے قیاسی نوعیت کے احکامات ہیں۔ مثال کے طور پر، منتخب مسائل سماجی رسومات کے معاملات، زکوۃ، جائیداد اور یتیموں کے معاملات، وراثت، سود، شراب کا استعمال، شادی، طلاق، جنسی تعلقات، بلوغت، چوری اور قتل وغیرہ کے بارے میں قانون سازی متعارف کروائی گئی۔

حدیث

مسلمانوں کی مضبوط علمی روایت سے نبرد آزما ہونے کے لیے مستشرقین نے بنیادی مآخذ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے حدیث کا انتخاب کیااس مقصد کے لیے انہوں نے حدیث کی حجیت، جمع وتدوین حدیث، حدیث کی سند، اس کی تاریخی حیثیت اور اس کا اسلامی قانون میں مقام جیسے موضوعات پر کام کیا۔اسپر نگر (1813۔1893)جو ایک آسٹرین اسکالر ہے اس نے حدیث نبوی کی صحت استناد کے حوالے سے شکوک شبہات کی تخم ریزی کی۔اس کی کتاب کا انگریزی ترجمہ 1856 میں چھپ چکا تھا۔ڈوزی(1820۔1883ء)ڈچ اسکالر ہے اس کے خیا ل میں بخاری کی آدھی احادیث قابل حجت ہیں۔ان سب اسکالرز کے ہاں تاریخی تنقید کا تصور پایا جاتا ہے جو بعد ازاں گولڈ زیہر (م:1921ء)تک آتے آتے یہ رجحان مکمل فلسفہ تشکیک اور مدلل تنقید وتردید صحت احادیث میں ڈھل چکا تھا۔سناؤک(1857ء۔1936ء)کے خیال میں حدیث اسلام کے ابتدائی تین صدیوں کے غالب گروپوں کی سوچ کی عکاس ہے ۔ اور حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ مختلف اغراض ومقاصد کے لیے گھڑا گیا ہے ۔ ھینری

[14]ibid, p 3,4

لامانس(1862ء۔1937ء) اور جوزف ہوروتس (1874ء۔1931ء)نے اپنے کام کو سند تک محدود رکھا۔جوزف شاخت (1902ء۔1969ء) نے فقہ اور قانون پر کام کرتے ہوئے حدیث پر مختلف پہلوؤں سے تنقید کی ۔یعنی اس نے حدیث کی تاریخی حیثیت کا چیلنج کیااور حدیث کی حجیت اور اس کی سند، حدیث کے ثبوت کے طریقہ کار، فقہاء کا حدیث کے بارے میں رویہ ، اور محدثین اور فقہاء کے مابین آویزش کی حیثیت وغیرہ کو زیرِ بحث لایا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک مستشرقین کے حلقوں اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والوں میں یہ بات مسلمات میں داخل ہو چکی تھی کہ احادیث کا ذخیرہ تاریخی اعتبار سے قابل اعتبار نہیں ہے–اور مسلمان مفکرین مثلاََ ڈاکٹر حمید اللہ،ڈاکٹر مصطفی الاعظمی،ڈاکٹر فواد سیزگین وغیرہ نے ان موضوعات پر بحث کی اور حلقہ استشراق کی علمی اور فنی نوعیت کی غلطیاں واضح کیں۔اسلامی قانون کی تشکیل میں حدیث کا بنیادی کردار ہے اگر یہ کہا جائے کہ حدیث سے مسلمانوں کی مضبوط علمی روایت کا پتہ چلتاہے تو بے جانہ ہو گا۔جن مستشرقین نے اسلامی قانون کے کسی بھی پہلو پر کام کیاانہوں نے حدیث پر ضرور کلام کیا ہے اس سے حدیث کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

وائل حلاق جو مغربی علمی دنیامیں اسلامی قانون و تاریخ اور اسلامی قانون کی تشکیل اور ارتقاء کے حوالے سے ایک معتبر نام سمجھا جاتا ہے۔اس نے حدیث کے بارے میں مستقل نوعیت کا ایک مضمون لکھااور اس کے لٹریچر میں مختلف جگہوں پر حدیث کی حجیت واہمیت،اس کی تاریخیت،اور شاخت اور دیگر مستشرقین کی حدیث پر نقد کا جائزہ وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ذیل میں حدیث کے بارے میں اس کا نقطہ نظر دیا جارہاہے۔

وائل حلاق احادیث کی تاریخی حیثیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Before we proceed, however, two historiographical remarks are in order…second, but more historiographically problematic is the authenticity of the reports about the deeds and utterance of the prophet.[15]

[15]ibid,p2,

دوسرا لیکن تاریخی طور پر ایک اور مسئلہ درپیش ہے وہ نبی کی روایات، ان کے افعال اور اقوال سے متعلق ان کی درستگی / حجیت ہے۔وائل حلاق نے اپنے پیشروؤں کے کام جائزہ لیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اس کے پیشرو جنھوں نے اسلامی قانون میں حدیث کے مقام پر کلام کیا ہے وہ اس بارے میں شکوک وشبہات کا شکار رہے۔اسی وجہ سے اس نے اپنے پیشروؤں کی تحریروں کے سامنے پسپائی کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے اور اپنا مؤقف بھی پیش کیا ہے:

However, mounting recent research, concerned with the historical origins of individual prophetic reports, suggests that Goldziher, Schacht and Juynboll have been excessively skeptical and that a number of reports can be dated earlier than previously thought, even as early as the Prophet. These findings, coupled with other important studies critical of Schacht's thesis, go to show that while a great bulk of prophetic reports may have originated many decades after the Hijra, there exists a body of material that can be dated to the prophet's time. Therefore, I shall not a priori preclude the entirety of prophetic reports as an unauthentic body of material, nor shall I accept their majority though many may have been admitted as autentic (sahih) by the Muslim "science" of hadith criticism[16].

تاہم ب پیغمبر کی اخبار واحد کے تاریخی مآخذ سے متعلق بڑھتی ہوئی تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گولڈزیہر، شاخت اور جونی بال بہت ہی زیادہ اس بارے میں تشکیک کا شکار رہے اور بہت ساری اخبار کو قدیم خیالات سے بھی جوڑا جا سکتا ہے حتیٰ کہ پیغمبر سے پہلے ادوار کے ساتھ بھی۔یہ نتائج، دیگر اہم مطالعات کے ساتھ جو شاخت کے مقالے پر تنقید کرتے ہیں، اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اگرچہ اخبار واحد کا ایک بڑا حصہ ہجرت کے کئی دہائیوں بعد شروع ہوا ہو گا، لیکن ایسے مواد کا ایک مجموعہ موجود ہے جو پیغمبر کے زمانے سے متعلق ہو سکتا ہے۔اسی لیے، میں نہ ذخیرہ احادیث کی وجہ سے پیغمبر کی روایات کو نہ ناقابل اعتبار ٹھہراؤں گا، نہ میں ان کی اکثریت کو قبول کروں گا، چاہے تو وہ مسلمانوں کے علمِ حدیث کے تنقیدی اصولوں کے مطابق صحیح ہو۔

[16]A History of Islamic legal theories , p 2.3

وائل حلاق عرب معاشرے میں سنت کے تصور اور سنت نبوی ﷺ میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

In this context, it is important to note that hadith was not yet synonymous with the verbal expression of Prophetic Sunna. Some hadiths were seen to contradict the widespread knowledge of established Sunna or sunan (especially when these constituted the basis of legal practice in the garrison towns and Medina), a fact to be expected in a milieu in which Prophetic biography eventually became the concern of a multitude of story-tellers, traditionists, judges, jurists and others. In an environment where fabrications of Prophetic materials were known to be widespread, it was inevitable that some circulated reports came to contradict local knowledge of the Sunna/sunan, knowledge that was transmitted mostly through practice and not orally.[17]

اس سیاق وسباق میں، یہ بات قابل توجہ ہے کہ حدیث ابھی تک پیغمبر کی سنت کے زبانی بیان کے مترادف نہیں تھی بعض روایات کو وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مستقل سنن یا سنت کے متصادم دیکھا گیاہے (خاص طور پر جب یہ سنن مدینہ اور فوجی چھاؤنیوں میں فقہی یا قانونی عمل کی بنیاد تھیں)، ایک ایسی حقیقت کی توقع کی جاسکتی ہے جس میں ایک ایسے ماحول میں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت واعظین، محدثین، قاضیوں، فقہاء اور دیگر کے لیے آخر کار ایک تشویش کا باعث بن گئی۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں پیغمبر سے متعلق موضوعی مواد پھیلا ہوا تھا، یہ ناگزیر تھا کہ کچھ گردش کرتی ہوئی روایات، سنت / سنن کے مقامی علم سے متضاد ہوں،، جو علم زیادہ تر عمل کے ذریعے منتقل ہوتا نا کہ زبانی بیان سے۔

The sunan constituted in themselves a source of the law even as the search for Prophetic Sunna got underway. Yet, by the end of the first century (ca. 715 AD), Prophetic Sunna had emerged as the queen of all sunan, though not of the legal sources on the whole. [18]

[17] The origins and Evolution of Islamic Law, New York: Cambridge University Press,2004,p71

[18] ibid, p69

وائل حلاق لکھتا ہے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری کے فقہاء نے اپنے نتائجِ فکر کو مقبول عام بنانے کے لیے ان کو پیغمبر کی طرف منسوب کرنے کی روش اپنائی۔ اور یہ تمام مواد عرب رسوم ورواج اور مفتوحہ علاقوں سے لیا گیا۔ وہ لکھتا ہےَ

That the legists in the first and second centuries thought their doctrines to carry an authority extending back to the Prophet is clear. Also clear is the fact that these doctrines encompassed, aside from the Quran, two types of legal material that hailed from two radically different sources. The first was Arabian, associated with the pre-Islamic laws and customs that were practiced or approved by the Prophet, and the second provincial, gradually but systematically assimilated into the normative practices of the Muslim community, practices that were perceived by Muslims to derive from the Sunna of the Prophet.[19]

یہ کہ پہلی اور دوسری صدیوں میں فقہاء کا خیال تھا کہ ان کے عقائد پیغمبر کی اتھارٹی قائم کرنے کے بارے میں واضح ہیں۔ یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ یہ عقائد قرآن کے علاوہ دو طرح کے قانونی مواد کو گھیرے ہوئے ہیں جن کا تعلق دو یکسر مختلف ذرائع سے ہے۔ پہلا عرب تھا، جو قبل از اسلام کے قوانین اور رسوم ورواج سے وابستہ تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ رائج یا منظور کیے گئے تھے، اور دوسرا صوبائی، بتدریج لیکن منظم طریقے سے مسلم کمیونٹی کے اصولی طریقوں میں ضم ہو گیا، وہ طرز عمل جو مسلمانوں کے خیال سے اخذ کیے گئے تھے وہ سنت نبوی ہے۔

اس نے حجیتِ حدیث کے لیے روایتی مغربی نقطہ نظر سے ہٹ کر اصول الفقہ میں حدیث کی اہمیت اور اسکے پرکھنے کے قواعد اجاگر کیے ہیں۔

The evidence of my argument is derived from a familiar field of Islamic traditional discourse, a field that has escaped the attention of modern hadith scholarship. This is legal methodology, properly known as us.l al-fiqh. In this methodology, Prophetic hadith is treated from a number of perspectives, but what concerns us here is

[19]A History of Islamic Legal theories ,pp17, 18

the perspective of epistemology which seeks to order the types of hadith on a spectrum that ranges from the dubious to the certain, by way of the central category of the probable.[20].

میرے استدلال کا ثبوت اسلامی روایتی مباحث کے ایک معروف شعبے سے اخذ کیا گیا ہے، ایک ایسا شعبہ جو علم حدیث کے بارے میں جدید اسکالرشپ کی توجہ سے ہٹا ہوا تھا۔ یہ قانونی منہج ہے، جس کو عمومی طور پر اصول الفقہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس منہج میں، حدیث نبوی کو راویوں کی تعداد کے لحاظ سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہاں ہمارے جو چیز تعلق رکھتی ہے وہ علمیات کا تناظر ہے، جو حدیث کو ایک سپیکٹرم پر ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے جو مشکوک سے لے کر یقینی تک، ظن کی مرکزی تقسیم کے ذریعے۔

And surely, the modern western debate about authenticity would be considered absurd if its object were to be confined to a handful of such hadiths. That the debate was not so confined, and that it dealt in fact with the vast majority of the hadith is quite obvious and need not be demonstrated. If both the traditionists and the jurists - the two most important groups in the study of hadiths - have acknowledged the precarious epistemological status of the literature, then we need not squander our energies in arguing about the matter of authenticity. We have been told that except for a score of hadiths, the rest engenders probability, and probability, as we know - and as we have also been unambiguously told by our sources - allows for mendacity and error. What more do we want?[21]

یقینی طور، حجیت کے بارے میں جدید مغربی بحث فضول ہو گی اگر اس کا مقصد ان کو مٹھی بھر ان احادیث تک محدود کر دیا جائے۔ یہ بحث اتنی محدود نہیں تھی، اور یہ کہ حقیقت میں حدیث کی اکثریت کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے، بالکل واضح ہے اور اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر محدثین اور فقہا دونوں - احادیث کے مطالعہ میں دو اہم ترین گروہ - نے اس لٹریچر کی غیر یقینی علمی حیثیت کو تسلیم کیا ہے تو ہمیں حجیت کے معاملے میں بحث کرنے میں اپنی توانائیاں ضائع کرنے

[20]Wael.B.Hallaq, Authencty of Prophet Hadith, Studia Islamica,1999,p78,

[21] ibid.pp89,90,

کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ چند احادیث کو چھوڑ کر باقی ظنی ہیں اور ظن - جیسا کہ ہم جانتے ہیں - اور جیسا کہ ہمیں ہمارے ذرائع نے بھی واضح طور پر بتایا ہے - جھوٹ اور غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ ہم مزید کیا چاہتے ہیں؟

اجماع

اجماع اسلامی قانون کا تیسرا اہم مآخذ ہے۔ وائل حلاق نے اسلامی قانون کے اس تیسرے اہم مآخذ کے بارے میں کلام کیا ہے اس کے خیال میں اجماع کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ نہ تو عقلی طور پر اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نص واضح طور پر اس کا ثبوت فراہم کر سکتی ہے اور نصوص سے جو دلائل فراہم کیے جاتے ہیں ان میں سقم بالکل واضح ہے۔ اور یہ مسئلہ کب پیدا ہوا؟ وائل حلاق کے خیال میں اجماع کی حجیت کا تصور اس وقت ابھرا جب مسلمان اس مسئلے میں پھنس گئے کہ وہ خود حجت ہیں یا خدا کا قانون حجت ہے، وہ لکھتا ہے:

The question of the authoritativeness of consensus arose only when it became necessary for Muslims to decide once and for all whether they themselves were the ultimate source of authority or whether that authority was God. In the Jahiliyya, the answer to this question was obvious; the sunna and the consensus of the tribe or the community constituted the law.[22]

حجیت کا سوال اس وقت ابھرا جب مسلمانوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ فیصلہ کریں کہ اتھارٹی کون ہے: وہ خود یا خدا؟۔ دور جاہلیت میں اس سوال کا جواب بالکل واضح تھا: کسی قبیلے یا معاشرے کا اجماع قانون بن جاتا تھا۔

مصنف کے خیال میں مسلمان فقہاء کو اجماع کی حجیت کی بحث کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب وہ فقہی اصول مرتب کر رہے تھے۔ اور ان کو اس مسئلے کی حجیت کے لیے اسلامی قانون کے دو بنیادی مصادر یعنی قرآن و سنت سے دلائل اخذ کرنے تھے۔ وہ اس بارے میں لکھتا ہے:

The crucial problem which posed itself was the foundation and validity of consensus as a religious doctrine. In other words, classical Muslim jurists, who undertook the task of developing usul

[22]Wael.B.Halaq, On the Authoritativeness of Sunni Consensus, International Journal of Middle Studies, Volume 18,1986, p 430

al-fiqh, had to prove that consensus rests on the strength of the two primary sources, the Qur'an and/or the Sunna. For, according to the fundamental Islamic tenet, nothing can be regarded as valid or binding if it is not somehow grounded in these sources.[23]

سب سے اہم ترین مسئلہ جس نے الجھن میں ڈال دیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اجماع کی بنیاد اور حجیت بطورِ دینی عقیدہ کی تھی۔ دوسرے الفاظ میں، قدیم مسلمان فقہاء، جنہوں نے اصول الفقہ کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا تھا، کو ثابت کرنا پڑا کہ اجماع کی بنیاد دو بنیادی مصدر یعنی قرآن وسنت پر تھی۔ بنیادی اسلامی اصولوں کے مطابق، کسی بھی چیز کو اتنی اہم یا واجب نہیں سمجھا جاسکتا اگر اس کی بنیاد ان دو مصادر میں نہ پائی جائے۔

وائل حلاق کے خیال میں یہ سوال کہ اجماع کبھی واقع ہوا ہے یا نہیں۔ اس کی مثالیں بہت قلیل ہیں۔

There remains the question of how consensus is determined to have occurred. Much theoretical discussion was devoted to this issue, but in practice knowledge of the existence of consensus on a particular case was determined by looking to the past and by observing that the major jurists were unanimous regarding its solution. And, as we have said, such cases were relatively few[24]-

یہ سوال باقی رہا کہ اجماع کا تعین کیسے ہوا؟ اس مسئلہ پر بہت زیادہ نظریاتی بحث کی گئی، لیکن عملی طور پر کسی خاص معاملے پر اجماع کی موجودگی کا علم ماضی پر نظر ڈال کر اور اس کے حل کے بارے میں بڑے فقہاء کا متفقہ مشاہدہ کر کے طے کیا گیا۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ایسے معاملات نسبتاً کم تھے۔

وائل حلاق کے خیال میں اجماع کی حجیت کو نہ تو قرآن کی روشنی میں ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی حدیث کی روشنی میں اور نہ ہی عقلی دلائل اس کے لیے مہیا کیے جاسکتے ہیں۔ کلاسک لٹریچر کی روشنی میں نتائج ان الفاظ میں اخذ کیے گئے ہیں:

The universal validity of consensus could not be justified by reason, since Muslims held that entire communities or "nations" could go, and indeed had gone, wrong even on important issues. But early

[23]ibid, pp 427.428,

An Introduction to Islamic Law, p22[24]

attempts by theoreticians to articulate a Quranic basis for consensus failed, since the Quran did not offer evidence bearing directly on it.[25]

اجماع کی آفاقی اہمیت کو عقل کی بنیاد پر نہیں مانا جاسکتا، کیونکہ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ سارا معاشرہ یا قوم اہم مسائل پر بھی غلطی پر جمع نہیں ہوسکتے۔ لیکن اصولیین کی قرآن کی بنیاد پر اجماع کو ثابت کرنے کی کوششیں ناکام ہو گئیں کیونکہ قرآن نے براہِ راست اس موضوع پر کوئی دلیل نہیں دی۔

اجتہاد

کسی بھی قانون میں خلا کا پہلو یہ ہے کہ وہ عصری تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت سے عاری ہو، مستشرقین نے اسلامی قانون کو جامد اور غیر متحرک ثابت کرنے کے لیے مختلف دلائل پیش کیے اور ان دلائل میں سب سے اہم پہلو چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کے عمل کا رک جانا ہے لیکن وائل حلاق اس کے برعکس رائے رکھتا ہے اس نے اجتہاد کے موضوع پر مستقل نوعیت کا ایک مضمون لکھا ہے اور اس کے علاوہ اس کی مختلف کتابوں میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے ۔شاخت، اینڈرسن، واٹ اور گب جیسے مستشرقین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے وائل حلاق نے اجتہاد کے عمل کو مسلم معاشرے میں جاری ہونا ثابت کیا ہے کیونکہ اجتہاد ایک ایسا عمل ہے جسکی مدد سے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکتا ہے، اور قانون سازی کے عمل میں اجتہاد کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وائل حلاق ایک مسلم اسکالر کے حوالے سے لکھتا ہے:

Thus it is clear that there was no school or a wing of a school inside the Sunni Muslim community that could have opposed ijtihad as a principle.[26]

اس طرح یہ بات واضح ہے کہ سنی مسلم گروہ میں کوئی گروہ یا گروپ ایسا نہیں ہے جو اصولی طور پر اجتہاد کی مخالفت کر سکا ہو۔

[25] An Introduction to Islamic Law, p 21

[26] Was the Gate of Ijtihad closed?, International Journal of Middle Studies, Volume16, No 1,1984,p 9,

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی سنی گروہ نے اصولی طور پر اجتہاد کی مخالفت نہیں کی تو پھر یہ نظریہ کہاں سے سامنے آیا کہ اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بند ہو گیا۔ وائل حلاق کے خیال میں دراصل یہ غلط فہمی اصطلاحات کو صحیح طرح نہ سمجھنے یا اس کے غلط استعمال سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

One of the most important elements that largely contributed to the deepening of this controversy is the misuse or the misunderstanding of technical terms. This was due to the absence of a common technical dictionary to which jurists would conform. Although some lawyers tried to define the terms used in describing the ranks of mujtahids, the majority of scholars remained confused. In the course of time, the degree of confusion increased steadily in legal literature.[27]

سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ فنی اصطلاحات کا غلط فہم یا استعمال نے اس تنازعہ کو گہرا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے یہ ایک عام تکنیکی لغت کی عدم موجودگی کی وجہ سے تھا جس سے فقہا موافقت کرتے۔ اگرچہ بعض وکلاء نے مجتہدین کی درجہ بندی کو بیان کرنے میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی، لیکن علماء کی اکثریت الجھن کا شکار رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فقہی ادب میں الجھن کی سطح میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔

وائل حلاق نے مسلم فقہی لٹریچر کا بھرپور انداز سے جائزہ لیا اور یہ ثابت کیا کہ اجتہاد کا عمل کسی بھی دور میں نہیں رکا بلکہ ہر دور میں جاری رہا۔ وہ لکھتا ہے:

It is difficult to assume that at the time the theory of usul was finalized_ about the beginning of the fourth/tenth century_ Muslims had decided to "close the gate of ijtihad". In fact, an examination of the writings of jurists after the third/ninth century well demonstrate that ijtihad was exercised with no interruption.[28]

---

[27] ibid,p25

[28] ibid, P 10

یہ فرض کرنا مشکل ہے کہ جب اصول الفقہ کو حتمی شکل دی گئی- تقریباً چوتھی/دسویں صدی کے آغاز میں – تو مسلمانوں نے اجتہاد کا عمل روکنے کا فیصلہ کر لیا۔ درحقیقت، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے بعد کی کتابوں کا مطالعہ اچھی طرح اس بات کو واضح کر دے گا کہ اجتہاد بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔

جدیدیت

جدیدیت عہدِ حاضر میں مسلمان معاشروں کے لیے تباہ کن اثرات لے کر آئی ہے۔ اس جدیدیت نے نا صرف معاشرتی، ثقافتی، سطح پر متاثر کیا ہے بلکہ دستوری سطح پر بھی اپنے ساتھ مسائل لے کر آئی ہے۔ وائل حلاق نے اسلامی قانون کے تصورات کو جدید ریاستی سطح پر قابلِ عمل بنانے کے لیے اسلامی قانون کے اصولوں پر بحث کی کہ وہ آج کے دور میں کس طرح ناقابل عمل ہیں۔ وائل حلاق نے جدیدیت اور اس کے خدوخال واضح کرتے ہوئے یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ ان سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے۔

Modernity is not only technology and science, Hollywood, McDonald's, and Calvin Klein jeans but also: psychology, an ethic, a set of values, an epistemology, and, in short, a state of mind and a way of life. Modernity is here to stay, at least for a long time to come. The realistic solution, therefore, is to alter what can be altered Iegal theory has in any case been on the back shelf for a century and a half and it is far more realistic and practical to remold it than to sweep modernity-with all its powerful values, institutions, and epistemologies- aside.[29]

جدیدیت نا صرف ٹیکنالوجی اور سائنس۔ ہالی وڈ، میکڈونلڈ، اور کیلون کیلن جینز ہی کا نام نہیں بلکہ نفسیات، اخلاقیات، اقدار کا مجموعہ، علمیات اور مختصراً دماغ کی ساخت اور ضابطہ حیات بھی ہے۔ جدیدیت یہاں قدم جمانے کے لیے آئی ہے کم از کم آنے والے طویل عرصے تک۔ اسی لیے اس کا حقیقت پسندانہ حل یہ ہے کہ ہر اس چیز کو تبدیل کر دیا جائے جو تبدیل ہو سکتی ہے، کیونکہ اصول الفقہ ڈیڑھ سو سال سے بہت سارے معاملات میں پسِ پشت چلے گئے ہیں اور یہ حقیقت

[29] A History of Islamic legal theories, p260

پسندانہ اور عملی حل یہ ہے جدیدیت کو ختم کرنے کی بجائے اس کی تمام طاقتور اقدار، اداراوں اور تصوراتِ علم کو تبدیل کر دیا جائے۔

جدیدیت کی پیداوار میں ریاست سرِ فہرست ہے اور ریاست کا قانون سے تعلق روح اور بدن جیسا ہے۔ وائل حلاق لکھتا ہے:

To practice law in the modern era is to be an agent of the state. There is no law proper without the state, and there is no state without its own, exclusive law. "Legal pluralism" can no doubt exist, but only with the approval of the state and its law. State sovereignty without a state-manufactured law is no sovereignty at all. If the way to the law is through the state, then Islamic law can never be restored, reenacted or refashioned (by Islamists or ulama of any type or brand) without the agency of the state.[30]

جدید دور میں قانون پر عمل کرنا ریاست کا ایجنٹ ہونا ہے۔ ریاست کے بغیر کوئی قانون مناسب نہیں ہے اور ریاست کے بغیر قانون کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ بلاشبہ قانونی تکثیریت پائی جاتی ہے لیکن ریاست اور قانون ان کو منظور کرتا ہے۔ ریاست کی حکمرانی بغیر ریاست کے قوانین کے ہرگز حکمرانی نہیں ہے۔ اگر قانون تک پہنچنے کا راستہ ریاست کے ذریعے ہے تو پھر ریاست کی ایجنسی کے بغیر اسلامی قانون نہیں بحال کیا جاسکتا، نہ دوبارہ نافذ کیا جاسکتا، اور نہ ہی اس کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ (اسلام پسندوں یا کسی گروہ کے علماء کے ذریعے)

If the modern reality of Muslims is unprecedented, then what is the solution? First of all, the traditional theory of *usul al-fiqh*is no longer sufficient to deal with the exigencies of modern life, even if we assume-against at odds-that a professional legal class, qualified to harness it, can be resurrected. This theory is essentially literalist, paying heed to the lexical and technical meanings of the revealed texts. In some cases, central to society and economy, no amount of interpretation can change the dictates of certain revealed texts. This

---

[30] An Introduction to Islamic Law ,p 169

theory therefore has no chance of any revival (much less success) unless a necessary and sufficient condition is met,:condition some recent Muslim intellectuals are arguing for, namely, that abandonment of all things, material and otherwise, that conflict or contradict with the dictates of this theory. In other words, on their view, much of modernity must be thrown to the wastebasket, for it is not only incongruent with Islam but also harmful in the first place.[31]

اگر مسلمانوں کی جدید حقیقت بے نظیر ہے تو پھر اس کا حل کیا ہے؟ سب سے پہلے، روایتی اصول الفقہ کی تھیوری جدید زندگی کی ضروریات سے نمٹنے کے لیے کافی نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ–ناقابل حمایت حالات کے بر خلاف۔پیشہ وارانہ قانونی طبقہ، جو اس سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ تھیوری بنیادی طور پر علم اللغۃ کے گرد گھومتی ہے اور نازل شدہ نصوص کے لغوی اور تکنیکی معانی پر توجہ دیتی ہے۔ بعض معاملات میں، معاشرے اور معاشیات کو مرکزیت دیتے ہوئے، کوئی شرح یا تعبیر بھی کسی الہامی متون کے قوانین کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اس تھیوری (بہت کم کامیابی کے ساتھ) کے احیاء کا کوئی امکان نہیں جب تک کچھ ضروری اور کافی شرائط پوری نہ کر دی جائیں: ایک شرط یہ ہے جس کے بارے میں کچھ جدید مسلمان دانشور یہ دلائل دے رہے ہیں کہ ہر اس لٹریچر سے دستبردار ہو جایا جائے جو اس تھیوری کے نتائج سے تضاد و اختلاف رکھتی ہے۔ دوسری لفظوں میں، ان کے خیال میں، جدیدیت کا زیادہ تر مواد ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے، کیونکہ یہ نا صرف اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ ایک لحاظ سے خطرناک بھی ہے۔

وائل حلاق سوال اٹھاتا ہے کہ آج کے مسلمان کو جدیدیت کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے:

Theory, however, is one thing, reality another. A most central and vexing problem remains, and the solution to it seems thus far untenable. The question that today's Muslims must answer is to what extent they are willing to subscribe to modernity and to adopt its

[31] A History of Islamic legal theories,p260

products. To reject it completely is obviously out of the question: modernity, we have said, is not merely a material phenomenon but primarily one that effected a systematic restructuring of psychology and epistemology, among many other things. Accordingly, if they were to adopt of it what suits them, what is to be adopted? If commercial, corporate, and other business laws are to be adopted, as they have and as they must, can Muslims do so while escaping the snares of usurious interest? 66 If they are to join the other nations in signing human rights charters and conventions, as they have, can they, or are they willing to, enact religious laws that grant their religious minorities an equal status? If the education of women has become an essential feature of their society, can the religious law forge for the Muslim woman a commensurate status compatible with her new role in society? If this status were to be accorded, can this law, while maintaining its intellectual and religious integrity, deal with the implications and consequences of this new role? And if all this were to take place, how are the revealed texts to be interpreted?[32]

تھیوری ایک اور چیز ہے جبکہ حقیقت اور چیز ہے۔ ایک سب سے زیادہ مرکزی اور پریشان کن مسئلہ باقی ہے، اور اس کا حل اب تک ناممکن نظر آتا ہے۔ آج کے مسلمانوں کو اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ وہ کس حد تک جدیدیت کو اپنانے اور اس کے اداروں کو اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ اسے مکمل طور پر رد کرنے پر تو بحث نہیں کی جاسکتی: جدیدیت، ہم نے کہا ہے کہ، محض ایک مادی رجحان نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر وہ ہے جس نے بہت ساری چیزوں کے ساتھ نفسیات اور علمیات کی ایک منظم تنظیم نو کو متاثر کیا۔ اگر اس کو قبول کرنا ہے تو کس کس پہلو سے قبول کریں۔ اگر تجارتی، کاروباری اور دیگر بزنس سے متعلق قوانین قبول کر لیے جائیں، جیسے وہ تھے اور جیسے ہونے چاہیں، تو مسلمان ایسا کر سکتے ہیں جبکہ سود کے پھندے سے کس طرح اپنی جان چھڑا سکتے ہیں۔ اگر وہ انسانی حقوق کے چارٹر اور کنونشنز پر دستخط کرنے کے لیے دوسری قوموں

[32]Wael.B.Hallaq, Can the Shariah be restored?

کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں، جیسا کہ ان کے پاس ہے، کیا وہ ایسے مذہبی قوانین نافذ کر سکتے ہیں جو ان کی مذہبی اقلیتوں کو برابری کا درجہ دیتے ہیں؟ اگر خواتین کی تعلیم ان کے معاشرے کی ایک لازمی خصوصیت بن گئی ہے، تو کیا مذہبی قانون مسلم عورت کے لیے معاشرے میں اس کے نئے کردار سے ہم آہنگ حیثیت پیدا کر سکتا ہے؟ اگر یہ درجہ دیا جائے تو کیا یہ قانون اپنی فکری اور مذہبی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس نئے کردار کے مضمرات اور نتائج سے نمٹ سکتا ہے؟ اور اگر یہ سب کچھ ہونا تھا تو نازل شدہ نصوص کی تشریح کیسے کی جائے گی؟

وائل حلاق کے خیال میں کسی بھی تھیوری کی کامیابی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کو خوبصورت علمی سطح پر پیش کر دیا جائے بلکہ اس کو سماجی سیاق وسباق میں مرتب کیا جائے تاکہ لوگ اس پر سہولت سے عمل کر سکیں۔ وہ لکھتا ہے:

However, the ultimate success of any legal methodology hinges not only upon its intellectual integrity and a sophisticated level of theorization but also upon its feasibility in a social context.[33]

کسی بھی تھیوری کی کامیابی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کو خوبصورت علمی سطح پر پیش کر دیا جائے بلکہ اس کو سماجی سیاق وسباق میں مرتب کیا جائے تاکہ لوگ اس پر سہولت سے عمل کر سکیں۔

Yet it is only the state that can bring about a revival of Islamic law, but not without the full participation of Muslim intelligentsia and, more important, not while the present regimes remain in power.[34]

تاہم یہ صرف ریاست ہی ہے جو اسلامی قانون کا احیاء کر سکتی ہے، لیکن مسلم دانشوروں کی مکمل شرکت کے بغیر نہیں اور اس سے بھی اہم بات موجودہ حکومتوں کے اقتدار میں رہتے ہوئے نہیں۔

خلاصہ بحث

اس میں کوئی شک نہیں کہ وائل حلاق عہدِ جدید میں مستشرقین کی صفوں میں اسلامی قانون کا ماہر ہے۔ اس نے اپنے کئی پہلوؤں سے اپنے پیشروؤں سے اختلاف کیا اور اسلامی قانون پر مختلف پہلوؤں سے کام کیا۔ اس نے قانونی ماخذ کے

[33] A History of Islamic legal theories,p254
[34] A History of Islamic legal theories, p260

لحاظ سے قرآن کے بیان کو درست تسلیم کیا ہے لیکن اس نے حدیث کی پرکھ کے لیے فقہاء کے طریقہ کار کو درست تسلیم کیا ہے کہ انہوں نے حدیث کی جانچ کے لیے صحیح طریقہ کار اختیار کیا ہے اور اسی طرح اس نے روایتی اسلامی قانون کے تیسرے ماخذ اجماع کے وقوع پذیر ہونے کو رد کیا اور مختلف ادوار میں اجماع کی حجیت کے بارے میں قرآن، حدیث اور عقلی طور پر پیش کردہ دلائل کو رد کیا ہے اور اس نے اسلامی قانون کو متحرک بنانے والے آلے اجتہاد پر اپنی توجہ خاص طور پر مرکوز کی کہ اجتہاد کا عمل مسلسل جاری رہا اور اس کے نتیجے میں مسلم دنیا میں اتنا بڑا علمی ذخیرہ وجود میں آیا۔ اس نے ان تمام تصورات کو، اجتہاد کا عمل چوتھی صدی ہجری میں رک گیا تھا، قدیم علمی ذخیرے میں موجود مواد کی مدد سے رد کیا اسی طرح اس نے اجتہاد کے بارے میں اپنے پیشروؤں کے دلائل کو رد کیا ہے اور اس نے اسلامی قانون کو عہدِ جدید میں قابلِ عمل بنانے کے جدید و قدیم دونوں اسکالرز کے کام کا جائزہ لیا ہے۔ اوروائل حلاق کا علمی دنیا میں جو سب سے اہم کام یہ ہے کہ اس نے مسلم دنیا پر استعماری اثرات کا جائزہ لیا ہے کہ کس طرح استعمار نے مسلم معاشروں کے اہم پہلوؤں کو متاثر کیا ہے اور اسی طرح علمی دنیا میں اسلامی قانون کو متاثر کیا۔ اور جدید ریاستی نظام میں قانون کی اہمیت وافادیت کو واضح کیا اور اسلامی قانون کو قابل عمل بنانے کے لیے تجاویز پیش کی ہیں۔ اس کے خیال میں اصول الفقہ میں جدید ریاستی نظام کے پیدا کردہ مسائل کے حل کی صلاحیت نہیں بلکہ اس کے لیے مصالح کے اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے وائل حلاق کے معلومات، ماخذات، تجزیہ اوراور نتائج سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے کام سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ترجمہ کی روایت

تحریر: ابو سجل

آج کے جدید دور میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے میں ترجمے کی روایت کو کیوں منظم کیا جائے؟

ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی بھی تہذیب یا قوم کے ادب کو منتقل کرنے کے عمل کو ترجمہ کہا جاتا ہے، اس کے کئی فوائد ہیں، اس کے ذریعے قدیم علمی خزانے کا تحفظ کیا جاسکتا ہے اور اس کی ترسیل اور ابلاغ کو ممکن بنایا جاسکتا ہے، دوسری اقوام کی ثقافت اور اقدار کے بارے میں اپنی قوم کو آگاہ کیا جاسکتا ہے، تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے عیسائی مذہبی انتہا پسندوں نے یونان کے علمی اثاثہ کو معدومیت سے دوچار کر دیا تھا پھر ان کے روشن خیال لوگوں نے فن ترجمہ کاری کے ذریعے یونان علمی ورثے کو محفوظ کیا، اسی طرح مسلمانوں کے دیگر اقوام اور تہذیبوں سے ربط میں بہت سارے عوامل کار فرما رہے، ان میں ترجمے کے عمل کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔

مسلمانوں کی تاریخ میں دور بنو امیہ اور دور بنو عباس کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے، مؤخر الذکر کو مسلم روایت کے شاندار دور میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں مسلمانوں نے دیگر اقوام سے ربط و تعلق کی بناء پر اپنے معاشرے کو علمی، فنی اور ثقافتی ترقی کے راستے پر ڈال دیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں بیت الحکمۃ کا قیام عباسی عہد کا سنہری کارنامہ ہے، یہ ایک بہت بڑی لائبریری تھی، جہاں صرف کتابیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ دیگر کئی اور شعبے بھی ہوا کرتے تھے اس دور میں لائبریریوں میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجم بھی کام کیا کرتے تھے، ان کی بنیادی ذمہ داری کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کرنا تھا سنسکرت زبان کے علمی خزانے کو ترجمہ کرنے کے لیے ہندو مترجمین متعین کیے گئے۔ ابو سہل اور ابو الفضل بن نوبخت یہاں کے مشہور مترجم مانے جاتے تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے دوسری سلطنتوں سے نایاب کتب کے حصول کے لیے اپنے نمائندے بھیجے۔ خلیفہ مامون کے دور میں قبل از اسلام کی شاعری، سرکاری مسودات، خطوط اور معاہدوں کو حاصل کیا گیا۔ سہل بن ہارون لائبریری کا منتظم اعلیٰ تھا اور ایک بہترین مترجم بھی تھا۔ 770 عیسوی میں سندھ سے ایک وفد خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں گیا تھا جس میں ایسے پنڈت بھی شامل تھے جو ہیئت اور ریاضیات کے ماہر تھے۔ ایک پنڈت اپنے ساتھ ہیئت کی مشہور کتاب لے گیا تھا۔ خلیفہ کو جب اس کتاب کے مندرجات کا علم ہوا تو اس نے اپنے دربار

کے ایک ریاضی داں ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ مذکورہ کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ کریں، علم ہیئت میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے اس کی بہت عزت افزائی ہوئی۔ پھر انہوں نے اپنے طریقے سے اس کتاب کے بنیادی اصولوں کو عربی میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا ان میں بہت ساری کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں کلیلہ و دمنہ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنسکرت کتابوں کا ترجمہ پہلوی میں ہوا اور پھر مؤخر الذکر زبان سے عربی میں کیا گیا۔ ان کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کی بہت ساری زبانوں میں عربی سے ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

یورپ کی تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کے واقعہ کو اہم ترین حیثیت حاصل رہی ہے، اس میں دیگر بہت سارے عوامل کار فرما تھے، وہاں ترجمہ کاری کے عمل کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے، اس کے ذریعے انہوں نے یونانی اور اسلامی فکر و فلسفہ کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ تاریخ، سیاست اور سائنس و طب سے متعلق صدیوں پر مبنی عملی و فکری ورثے کو اپنے ہاں منتقل کیا۔ آج بھی یورپی اسکالرز اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کی عربی کتب کے تراجم نے اہم کردار ادا کیا۔

انسان اور انسان، قوم اور قوم کے درمیان بہت سی دیواروں کو توڑنے کے لیے جو کارگر ہتھیار ہیں ان میں ترجمہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بے شمار زبانوں کی موجودگی ایک مسلمہ حقیقت ہے جو اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ تراجم کی ضرورت ہر دور میں مسلمہ رہی ہے اور رہے گی۔ اگرچہ اس کو تصنیف کے مقابلے میں کم اہم سمجھا گیا ہے، ورنہ ترجمہ کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔۔ یہ بات درست ہے کہ اس فن کو وہ مقام نہیں ملا جس کا یہ مستحق تھا۔ ترجمے کے لیے ٹرانسلیشن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ماہرین کے نزدیک کامیاب مترجم وہ نہیں جو دونوں زبانوں سے شناسائی رکھتا ہو بلکہ وہ ہے جو source language کی تہذیب اور روایات سے نا صرف شناسا ہو بلکہ ایک گونہ اس سے لگاؤ بھی رکھتا ہو کیونکہ تہذیبی روایات کو سمجھے بغیر معنی تک پہنچنا بعض اوقات محال ہو جاتا ہے۔ مترجم خود اس علم کا ماہر ہو جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہے اور دوسرا ترجمہ کرتے وقت ان لوگوں کو ذہن میں رکھا جائے جن کے لیے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کا علم کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اس زبان کی لسانی علمی ادبی اور تمدنی پہلو سے بھی پوری طرح واقف ہو جس میں لکھی کسی تحریر کو

ترجمہ کی صورت دے رہاہے یعنی S.L اور T.L دونوں سے اگر قابل قدر واقفیت نہیں تو معلومات کی ترسیل صحیح ہونے کے امکانات مخدوش ہو جاتے ہیں۔ ترجمے میں تمام سائنسی علوم وفنون بھی شامل ہوتے ہیں اس طرح کے تراجم کا بنیادی مقصد معلومات کی تفصیل فراہم کرنا ہوتا ہے ترجمے کی زبان جتنی صاف شفاف اور شستہ ہو گی اور قاری کے ذہنی سطح سے قریب ہو گی مترجم اپنے مقصد میں اتناہی کامیاب ہو گا۔

علمی تحریر کا ترجمہ کرتے وقت مترجم سب سے زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کسی فن کی اصطلاح کا اپنی زبان میں زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ علمی اصطلاحات وضع کرتے وقت اس عمل کا بالخصوص خیال رکھنا چاہیے کہ اصطلاح روایتی اصولوں کے عین مطابق ہو۔ نیز لاطینی یونانی اور دوسرے سابقوں اور لاحقوں کی طرز میں مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ جہاں تک علمی اور فنی تراجم کا تعلق ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ مضمون اور علم کا ماہر یہ فریضہ سرانجام دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علم وفن میں اصطلاح کا اپنا مفہوم ہوتا ہے جو دوسرے علم و فنون میں نہیں ہوتا۔ مسلم ثقافت کا لفظ عمرانیات میں کچھ اور معنی دیتا ہے اور فلسفہ میں اس کا کچھ اور مفہوم متعین ہے ۔اس سطح پر اس کی ایک بہترین مثال مولانا ظفر علی خان کا ترجمہ معرکہ مذہب اور سائنس ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیگر اقوام کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لیے کن کتب کا ترجمہ کیا جائے ؟ سماجی علوم سے متعلق کتب کا ترجمہ ضروری ہے یا سائنسی کتب کو اپنی زبان میں ترجمہ کیا جائے یا عالمی ادب کو اپنی زبان میں منتقل کیا جائے ؟ دوسری اقوام سے استفادہ کے عمل کو نچلی سطح پر منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ ہر علم وفن کا کیا جائے۔ کیونکہ آج دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے اور آپ اپنی قوم کو کسی دوسری قوم سے استفادہ کرنے سے نہیں روک سکتے۔

جیسا کہ اس رسالے میں کسی جگہ پر ذکر ہو چکا ہے کہ جب استعماری طاقتوں نے اپنی نو آبادیات کو مکمل قابو کرنے کے لیے قانونی طریقہ اختیار کیا، اور انہوں نے ان کے قوانین میں ردوبدل شروع کیا، اس کام کے لیے مستشرقین نے ہر اول دستے کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے اسلامی قانون کے بارے میں مطالعے کا آغاز اٹھارویں صدی کے اخیر میں کیا اور منظم اور مربوط مطالعے کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں کیا۔ شروع میں انتظامی معاملات چلانے کے لیے بعض

فقہی کتب کا ترجمہ کیا گیا۔ جیسا کہ معروف فقہی کتاب ہدایہ کو انگریزی زبان میں منتقل کیا گیا۔ اسی طرح سراجیہ کو بھی انگریزی کے قالب میں منتقل کیا گیا۔

اردو میں ترجمہ نگاری کی تاریخ میں ہندوستان کے مختلف اداروں نے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ اردو کے کے نثری تراجم کے تذکرہ میں انجمن ترقی اردو کا نام سرفہرست ہے، 1903ء میں یہ انجمن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبے کے طور پر وجود میں آئی۔ اس کا مقصد اردو زبان اور ادب کی ترقی اور فروغ تھا اس کے پہلے صدر پروفیسر تھامس آرنلڈ اور سیکرٹری علامہ شبلی تھے علامہ شبلی اور مولوی عبدالحق نے خاصی تعداد میں ترجمے کیے۔ اصطلاح سازی کے فن پر مودی سید وحید الدین سلیم کی وضع اصطلاحات نام سے ایک کتاب شائع کی اس موضوع پر یہ اردو کی پہلی کتاب ہے۔ اسی طرح ان اداروں میں میں سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی غازی پور اور دارالمصنفین علی گڑھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں کے کارناموں کی تفصیل دیکھنے کے لیے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی مغرب سے نثری تراجم کا مطالعہ بہتر کتاب ہے۔

امریکی استشراق کا تعارف

طوبیٰ گل

لیکچرر (وزٹنگ) یونیورسٹی آف میانوالی (میانوالی)

عہد حاضر میں امریکہ جہاں سیاسی، اقتصادی اور عسکری قیادت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئے ہے وہاں علم و تحقیق کے میدان میں بھی اس کی تحقیقات بہت آگے ہیں جس کی وجہ سے استشراقی سرگرمیوں کا مرکز و محور بھی یہی علاقہ بن چکا ہے۔ اس کے ادارے اتنے منظم اور مربوط ہو چکے ہیں کہ دنیا بھر میں اس کی تحقیقات پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس کے اداروں کی رپورٹس کو مستند تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس کے قائم کردہ اداروں کی رپورٹس کی روشنی میں دنیا بھر کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ امریکہ میں استشراق کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں، یعنی اس کے دو ادوار ہیں: ذیل میں ہم اس کے دو ادوار کے بارے میں گفتگو کریں گے، جس میں اس دور کی خصوصیات، سرگرمیاں، نامور اسکالرز، اداروں وغیرہ کے بارے میں مختصر تعارف کروائیں گے۔

پہلا مرحلہ:

امریکہ میں استشراقی سرگرمیوں کا آغاز برطانیہ کے زیرِ سایہ ہوا، اور انہوں نے شروع میں عیسائیت کی ترویج واشاعت کے لیے کام کیا، ان کی ساری سرگرمیوں کو مذہبی پہلو سے بڑی اہمیت حاصل رہی، انیسویں صدی کے آغاز میں انہوں نے تبشیری سوسائٹی کی بنیاد رکھی، اور انہوں نے دنیا بھر میں عیسائیت کے فروغ کے لیے تبلیغی جماعتوں کو بھیجنے کا اہتمام کیا، اس کے لیے پہلا وفد 1830 میں لبنان میں بھیجا گیا، جس نے وہاں ایک مشنری ادارہ قائم کیا، بعد میں وہی ادارہ یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ اس مرحلے کی اہم شخصیات میں فلپ خوری حتی ہیں۔

فلپ خوری حتی(Philip K. Hitti

فلپ خوری حتی(1886-1978) لبنان سے تعلق رکھتا تھا، مذہباً عیسائی تھا، اس نے عرب ثقافت کے مطالعے کے موضوع کو امریکہ میں متعارف کروایا۔ امریکن یونیورسٹی آف بیروت سے تعلیم حاصل کی اور فراغت کے

بعد یہیں سے تدریس کا آغاز کیا، 1915ء میں کولمبیا یونیورسٹی امریکہ سے زبانوں کے موضوع پر پی ایچ ڈی حاصل کی۔ 1954 تک پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں مشرقی زبانوں کے شعبہ کا چیئرمین رہا اس کی معروف کتب میں

- History of the Arabs
- The Arabs: A Short History"
- including Lebanon and Palestine: History of Syria :
- "Lebanon in History"
- The Near East in History"
- Islam in the West
- Makers of Arab History
- Islam: A way of Life
- Capital cities of Arab Islam

مذکورہ کتب 1943، 1937ء، 1957ء، 1961ء، 1962ء، 1968ء، 1970ء، 1973ء میں بالترتیب شائع ہوئیں۔

موصوف امریکہ میں عرب مسائل کے دفاع کی نمائش کرتا ہے اور مشرق وسطیٰ کے معاملات کے سلسلے میں امریکی وزارت خارجہ کا غیر سرکاری مشیر ہے، اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ انسانی ثقافت کی تعمیر میں اسلام کے کردار کو مجروح کرے، وہ کسی بھی فضیلت و عظمت کو مسلمانوں کی طرف منسوب کرنا گوارا نہیں کرتا ہے۔ مثلاً اس نے 1948 میں شائع شدہ "دائرۃ المعارف الامریکیۃ" میں "الادب العربی" کے عنوان کے تحت ص:129 پر تحریر کیا ہے:

"ولم تبدا امارات الحیاۃ الادبیۃ الجدیدۃ بالظھور الا فی القسم الاخیر من القرن التاسع عشر، وکان الکثرۃ من قادۃ ھذہ الحرکۃ الجدیدۃ نصاریٰ من لبنان تعلموا واستوحوا من جھود المبشرین الامریکیین"

"اور عرب کے یہاں جدید ادبی زندگی کے آثار و علامات اُنیسویں صدی کے اخیر میں ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ اس نئی تحریک کے قائدین کی اکثریت لبنان کے نصاریٰ کی تھی جنھوں نے امریکن مشنریز سے تعلیم و تربیت حاصل کی اور جن کے افکار و نظریات کی تشکیل مستشرقین کی تعلیمات سے ہوئی۔

صمویل زویمر Samuel M. Zwemer

جیسے لوگوں نے عرب میں عیسائیت کے فروغ کے لیے کام کیا، اس کی قیادت میں کئی عالمی تبشیری کانفرنسز بھی منعقد ہوئیں جن میں 1911ء میں لکھنؤ اور 1935ء میں بیت المقدس میں ہونے والی کانفرنسز کو بہت شہرت ملی۔ اس مرحلے کی نمایاں خصوصیات میں عیسائی مذہب کے فروغ کے جذبے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔

دور حاضر میں امریکی مستشرقین کا سب سے اہم ترین رسالہ "The Muslim World" ہے۔ موصوف نے 1911 میں اس کی بنیاد رکھی اور اس وقت یہ رسالہ امریکہ کے شہر ہارٹفورڈ Hartford سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ کا مدیر اعلیٰ کینتھ کریگ k.Cragg نامی ایک شخص ہے۔

دوسرا مرحلہ:

بیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ تحریک استشراق کی منتقلی کا عمل ہے، جس میں یورپ سے تحریک استشراق کی قیادت چھین کر اس کو امریکہ کے حوالے کرنا ہے، یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم کے بعد 1950ء کے لگ بھگ میں واقع ہوا ہے۔ اور اس کا مرکز ہارورڈ یونیورسٹی بن گئی۔ اور اس ملک کی مختلف جامعات کولمبیا، شکاگو، پرنسٹن اور پنسلوانیا وغیرہ میں استشراقی مطالعات کے سنٹرز وغیرہ قائم ہوئے۔

نامور اسکالرز

ہملٹن گب:

ایک نمایاں شخصیت گب (H.A.R Gibb)(1895ء۔ 1971ء) ہے۔ اس کی تصانیف اگرچہ بہت سی ہیں، تاہم اصل شہرت کتاب Muhammadanism سے ہوئی جو 1949ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے نام کے سلسلہ میں گب نے خود توجیہات پیش کی ہیں لیکن یہ نام اور توجیہات خود اس کے شاگرد اسمتھ کو پسند نہیں آئیں۔ بنیادی طور پر گب تاریخ دان تھا لیکن اس نے اسلامی علوم کے کئی موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گب کے یہاں مختلف نظریات، تصورات اور خیالات میں ارتقاء واقع ہوا اور وقت وحالات کے تحت بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے

جس کا ثبوت اس کی مختلف تحریروں سے ملتا ہے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں بہر حال اس نے اسلام کے بارہ میں نرم روی کا مظاہرہ کیا۔

اس نے نہ صرف برطانوی اہل علم بلکہ امریکی اہل دانش پر بھی اپنے نقوش چھوڑے۔ 1955ء میں اس نے Harvard میں ملازمت کی۔ قرآن اور حدیث کے بارے میں اس کے نظریات ہنگری، ولندیزی اور جرمن علماء سے ملتے جلتے تھے۔

اس کی معروف کتب میں " Arabic Literature: An introduction"اور " Modern Trend of Islam"اور"Studies on the Civilization of Islam"اور"Shorter Encyclopedia of Islam"ہے جس کی اس نے ایڈیٹنگ کی ہے۔ اور یہ 1953ء میں شائع ہوا ہے۔ تاریخ اسلام پر اس کی ایک کتاب ہے جو"Mohammedanism: An Historical Survey"کے نام سے پہلے 1949ء میں شائع ہوئی اور پھر 1980ء میں ایک نئے عنوان " Islam; An Historical Survey"کے ساتھ شائع ہوئی۔

<u>برنارڈ لیوس</u>

برنارڈ لیوس (پ: 1916ء) برطانوی نژاد امریکی یہودی مستشرق ہیں جو پرنسٹن یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر رہ چکا ہے دوسری جنگ عظیم میں برطانوی شاہی بکتر بند کور(Royal Anlrmoured Corps)میں ایک سپاہی کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں۔ جنگ سے واپسی پر 1949ء میں یونیورسٹی آف لندن میں 'School of Oriental and African Studies'میں مشرق قریب اور مشرق وسطی کی تاریخ 'Near and Middle East history' کا استاد مقرر ہوا۔

1936ء میں اس نے یونیورسٹی آف لندن سے سے مشرق وسطیٰ کی تاریخ پر بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور اس کے تین سال بعد ہی تاریخ اسلام میں اس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی تھی۔ 1939ء میں یونیورسٹی آف لندن کو

لیکچرار کے طور پر جوائن کر لیا1974ء میں پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ سے منسلک ہوا1986ء میں یہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے کارنیل یونیورسٹیCornell universityکو جوائن کر لیا۔

1966ء میں اس نے شمالی امریکہ کی علمی سوسائٹی "Middle East studies Association of North America"کو بطور تاسیسی ممبر کے جوائن کیا لیکن 2007 میں اس نے اس تنظیم کو چھوڑ کر اپنی نئی تنظیم ' Association for the Study of Middle East And Africa' کے نام سے بنالی کیونکہ پہلی تنظیم میں ایسے امریکی اسکالرز کی کثرت تھی جو مشرق وسطیٰ میں امریکی اور اسرائیلی کردار پر شدید نقد کرتے تھے۔ جبکہ برنارڈ لیوس امریکی اور اسرائیلی حکومت کا پرزور حمایتی تھا۔

1990ء میں اس نے امریکی وفاقی حکومت کے تحت اپنے مشہور زمانہ لیکچرز دیے جو بعد ازاں 'The Root of Muslim Rage'کے نام سے شائع ہوئے۔

- The Origin of Ismailism(1940)
- The Arabs in History(1950)
- Istanbul and the Civilizations of the Ottoman Empires(1963)
- The Middle East and the West(1964)
- The Assassin: A Radical Sect in Islam(1967)
- History- Remembered, Recovered, Invented(1975)
- Muslim discovery of Europe(1982)
- the Jews of Islam(1984)
- the political language of Islam
- Islam and the west(1993)
- Islam in history(1993)
- the shaping of the modern Middle East(1994)
- cultures in conflic(1994)
- the Middle East a brief history of last 2000 years
- the future of the Middle East(1997)

- What went wrong?: The Clash Between Islam and Modernity in the Middle East(2002)
- The Crisis of Islam: Holy War and Unholy Terror(2003)
- Islam: The Religion and the People(2008)
- Faith and Power: Religion and Politics in the Middle East(2010)
- The End of Modern History in the Middle East (2011)

برنارڈ لیوس کو مغرب میں مشرق وسطی کی تاریخ پر ایک سند کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کے اثر ورسوخ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بش انتظامیہ اپنے دور حکومت میں اس کے مشوروں سے خارجہ پالیسی مرتب کرتی تھی۔ اسے' The most influential post war historian of Islam and the Middle East کا ٹائٹل بھی دیا گیا۔

برنارڈ لیوس کے افکار و نظریات پر ایڈورڈ سعید(1935-2003)Edward Said نے شدید تنقید کی۔ کیونکہ کتاب 'Orientalism' اپنے موضوع پر ایک مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے تحریک استشراق کو پرکھنے کے نئے زاویے متعارف کروائے ہیں۔ ان دونوں کے مابین تقریبا پچیس سال تک زبردست قلمی مکالمہ ہوا۔ ان دونوں کے اثر ورسوخ کی وجہ سے مغرب میں مشرق وسطی اور اسلام کی تاریخ کے حوالہ سے دو مستقل مکاتب فکر وجود میں آگئے۔ ایڈورڈ سعید نے برنارڈ لیوس کو صیہونی سازشوں کا شکار ہونے اور اسرائیل صیہونی ریاست کی توسیع کے لیے پروپیگنڈا مہمیں چلانے کا بھی الزام دیا۔

سموئیل ہنگٹن(*Samuel* Phillips *Huntington*)

موصوف 1927 کو پیدا ہوئے اور 2008 میں وفات پائی ۔اس کو اپنی کتاب The Clash Civilizations کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔

فریڈ ایم ڈونر(1945)

معروف امریکی مستشرق فریڈ ایم ڈونر(1945) نے ابتدائی اسلامی تاریخ کے بارے میں مختلف کتب تحریر کی ہیں، ہمارے موجودہ موضوع سے متعلق اس کی معروف کتاب:Narrative of Islamic Origins ہے، اس

کتاب کے بارے میں ڈاکٹر فیروز الدین شاہ اپنی کتاب مطالعہ اسلام اور استشراقی تنقیدات (ص217) پر لکھتے ہیں: مستشرقین کے اسلامی مآخذ کے بارے میں طرز فکر کے ادراک کے لیے موصوف کا تجزیاتی مطالعہ بڑی حد تک ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسلامی بنیادوں کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے اسلامی مآخذ پر تشکیک کا یہ نظریہ ہے کہ اسلامی روایات کا اکثر حصہ ناقص یا سرسری سا ہے جو اسلامی بنیادوں کی ایک مبہم اور مشکوک تصویر کشی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم طلوع اسلام کی حقیقت کے متعلق بہت کم جانتے ہیں لیکن اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت حال تک پہنچنے کے لیے ہم اسلامی روایات کے متبادل کو کیوں پیش کرتے ہیں؟ اگر ہم واقعی نہیں جانتے کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا تو پھر یقیناً اسلامی روایات کسی بھی متبادل کے طور پر معلومات مہیا کرتی ہیں۔

خصوصیات:

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی اپنی کتاب تفہیم استشراق میں اس مرحلے کے بیان میں درج ذیل خصوصیات بیان کرتے ہیں:

1. سیاسی، عسکری اور اقتصادی میدان میں امریکی غلبہ واقتدار میں غیر معمولی اضافہ۔
2. امریکی یونیورسٹیوں میں خصوصا مسلم ممالک اور عموما مشرقی ممالک کے طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کی تعداد میں کثرت جس نے استشراقی سرگرمیوں میں اضافہ کیا۔
3. امریکی ذرائع ابلاغ میں بے مثال ترقی جس نے اسے مشرق سے تعامل میں برطانیہ سے کہیں آگے کر دیا۔
4. سرد جنگ کے زمانے میں دنیا پر امریکی تفوق و برتری کو بنائے رکھنے کے لیے استشراقی معاملات کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔
5. عالم اسلام اور عربی کی طرف امریکہ کی خصوصی توجہ نے امریکی استشراق کو خاص رنگ دیا۔
6. امریکہ میں مختلف وسائل حیات پر صہیونی غلبہ و تسلط نے بھی امریکی استشراق کو ایک خاص رُخ اور جہت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہارورڈ یونیورسٹی کا تعارف:

امریکہ میں مختلف ادارے مختلف ناموں سے استشراقی، جدیدیت یا استعماری سرگرمیوں کے حوالے سے مصروفِ عمل ہیں۔ ان کے تعلیمی ادارے جہاں اپنی قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہی ہے وہاں ان کے تحقیقی ادارے بھی اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ وہاں علاقائی مطالعے، مذاہب کے تقابلی مطالعے اور اس طرح کے دیگر شعبہ ہائے جات اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ انہی اداروں میں ہارورڈ یونیورسٹی کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے قدیم ترین ادارہ ہے جو 1636ء میں قائم کی گئی۔ اس میں جہاں دیگر شعبہ جات قائم ہیں وہاں اس میں مشرق وسطیٰ کے مطالعے کے لیے ایک ادارہ قائم ہے۔

Center for Middle Eastern Studies (CMES)

کو 1954ء میں قائم کیا گیا جس کو اس موضوع پر قائم کیے اداروں میں دنیا بھر میں ایک بہت بڑا اور نمایاں ادارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے مطالعہ کے لئے ہارورڈ کا مرکز کی اہمیت کو بڑے پیانے پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ادارہ مذکورہ خطہ کے قدیم اور جدید دونوں پہلوؤں کو احاطہ کرتا ہے، لیکن اس کی دلچسپی دنیا بھر کے اسلامی معاشروں اور ثقافتوں کے مطالعے سے ہے۔ 2005ء میں Prince Alwaleed Bin Talal Islamic Studies Program (AISP) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے علاوہ Islamic Heritage Project بھی قائم ہے۔ جس میں مخطوطات، مطبوعہ کتب اور نقشہ جات کی ڈیجیٹل کولیکشن موجود ہے۔ اسی طرح الولید بن طلال اسلامک اسٹڈیز پروگرام کے تحت 20 مئی 2022ء میں انڈر گریجوایٹ کی سطح پر لکھے گئے ایک مقالے کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا، مقالہ نگار فرح آفیوی FarahAfify ہیں، جن کے مقالے کا عنوان ہے:

Radical and Muslim: Islamic Liberationist Thought in the Black

اسی طرح مذکورہ بالا سنٹر کی 2022 میں ہونے والے پروگراموں اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو درج ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان معلومات کی روشنی میں سنٹر کے مطالعاتی رجحان کا پتہ چلتا ہے:

26 جنوری 2022 کو ایک سیمینار منعقد ہوا، جس کا عنوان تھا:

Chinese-Speaking Muslims' Responses to Islamic Intellectual Trends from West, South and Central Asia during the Nineteenth Century

24 فروری 2022 کو درج ذیل عنوان پر سیمینار منعقد ہوا:

Debating Muslim Legal Sovereignty in Colonial India

24 مارچ 2022 کو ایک سیمینار منعقد ہوا

Ibn 'Asakir of Damascus and His Many Legacies: Sunni Revivalist, Jihad Advocate and, &Syrian 'Nationalist'

7 اپریل 2022 کو جو سیمینار منعقد ہوا، اس کا موضوع تھا:

What is Post-Classical Philosophy in Islam and How is it Different from Philosophy in Islam's Classical Period?

29 اپریل 2022ء میں ایک مطبوعہ کتاب کے بارے میں پروگرام منعقد ہوا،

A Medieval life in Modern Circumstances

رسالہ:

ہارورڈ یونیورسٹی کے تحت جو رسالہ نکلتا رہا ہے وہ مشرق وسطیٰ اور اسلامی دنیا کے ایشوز زیرِ بحث لاتا تھا۔ اس کا نام ہے: Harvard Middle Eastern and Islamic Review *(HMEIR)* 1994ء میں اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس کو Center for Middle Eastern Studies (CMES) کے تحت شائع کیا جاتا تھا۔ اس کی اشاعت آج کل غیر معینہ مدت تک کے لیے معطل ہے، جبکہ اس سے قبل 2009 تک باقاعدگی سے اس کی اشاعت جاری رہی۔

تحریک تجدد اور متجددین

کتاب کا نام: تحریک تجدد اور متجددین

مصنف: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

سن اشاعت: فروری 2022

ناشر: دار البصیرۃ پبلی کیشنز

طباعت: دوم

صفحات: 144

قیمت: 460 روپے

تبصرہ نگار: ادارہ

کیا اسلام ہر دور کے تقاضے نبھانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ یا اسلام ہر دور کی ضروریات کو پوری کرتا ہے؟ کیا اسلام کی تعلیمات فرد کی ذات سے لے کر عبادت گاہوں تک محدود ہے؟ زندگی کے ہر لحظہ بدلتے حالات میں اسلام کی تعلیمات کہاں تک کارگر ہیں؟ اور اس طرح کے دیگر سوالات عہدِ جدید کے پیدا کردہ ہیں، یہ سوالات، اشکالات اور اعتراضات وغیرہ صدیوں کے علمی سفر کے نتیجے میں سامنے آئے، دو چار برس کی بات نہیں ہے۔ زمانہ "فتنوں" کی زد میں ہو تو اس دور کے علماء عامۃ الناس کو ان کی گمراہیوں سے آگاہ کرنے کے لیے اپنی قلمی، علمی اور عملی کاوشوں سے اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، یہ سلسلہ زمانوں سے چلا آرہا ہے، برصغیر کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو سر سید احمد خان پہلے آدمی ہیں جنہوں نے پورے خلوص سے مسلمانوں کو دنیاوی ترقی کے راستے پر ڈالنے کے لیے علمی تحریکوں کی بنیادیں رکھیں، اور اس کے لیے انہوں نے مذہبی طبقے کی طرف سے شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑا، اور پھر اس کے بعد ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا، علماء نے اپنی مذہبی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے ہر دور کے فتنے کو مختلف طریقوں سے رفع کرنے کی کوشش کی۔

زیرِ تبصرہ کتاب معروف مذہبی اسکالر ڈاکٹر حافظ محمد زبیر کے مختلف ادوار (2010 اور 2011) میں لکھے گئے مضمون کا مجموعہ ہے، راقم نے مقدمہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مصنف کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ بعض مضامین خلاصے کے طور پر لکھے گئے جیسا کہ علامہ پرویز کے بارے میں ہے۔ بعض موضوعات پر تلخیص پیش کی گئی، بعض کے بارے میں معمولی اضافے کیے گئے، بعض مضامین کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا اول ان لوگوں کا ذکر موجود ہے جن پر لفظ متجدد بالکل صادق آتا اور دوسرا ان لوگوں کا تذکرہ کیا جن پر مستقل لفظ تجدد تو صادق نہیں آتا ہے لیکن رجحان تجدد کی طرف محسوس ہوتا ہے۔

کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مصنف کی موضوع کے بارے میں قلم کی روانی اور معلومات کے بارے میں عرق ریزی واضح محسوس ہوتی ہے، باب اول میں تحریک تجدد کی تاریخ کے لیے مختص کیا گیا، اس میں دو ادوار کو خاص طور پر شامل کیا گیا، اس میں ایک تو صدر اول میں تحریک معتزلہ کے اصولِ خمسہ لکھے گئے جبکہ دوسرا دور موجود دور کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر کے بارے میں صرف ایک صفحہ مختص کیا گیا ہے، اور لکھتے ہیں: مغرب میں روشن خیالی اور احیائے علوم کی مذہب بیزار تحریک کے جراثیم ایک متعدی بیماری کی طرح مقبوضہ مسلمان ممالک میں بھی منتقل ہوئے۔ مسلمان امت کا ایک بہت بڑا، ذہین اور متحرک طبقہ اس تحریک سے متاثر ہوا اور اس نے دین اسلام کی ایسی ایسی تعبیرات اور تشریحات پیش کیں کہ جنہوں نے اس دین توحید کے عقائد اور بنیادوں کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا اور دین اسلام کا ایک ایسا جدید ایڈیشن تیار کیا جو علمائے یورپ کے توہمات پر تو سو فیصد پورا اترتا ہے لیکن اس میں محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا اسلام ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا تھا (ص22) آگے لکھتے ہیں: ان متجددین کے ہاں امت کے متفق علیہ مسلمہ عقائد سے انحراف کے مقامات کو بھی واضح کریں گے (ص23)

مذکورہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب تحریک تجدد کی تاریخ کے بارے میں ہے جبکہ دوسرا باب مصر کی تحریک تجدد کے بارے میں لکھا گیا جس میں سید جمال الدین افغانی، مفتی عبدہ، رشید رضا، طٰہٰ حسین، توفیق الحکیم، یوسف قرضاوی، وحبۃ الزحیلی جیسے اسکالرز کے تذکرہ پر

مشتمل ہے، جبکہ تیسرا باب ترکی کی متجددانہ تحریک کے لیے مختص کیا گیا اور اس میں صرف مصطفی کمال پاشا کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھا باب برصغیر کے حوالے سے ہے جس میں سر سید احمد خان، علامہ پرویز اور ڈاکٹر طاہر القادری کا تذکرہ کیا گیا ہے مصر کی جدیدیت کی تحریک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا: (1) مصلحینِ امت، (2) ادباء وشعراء، (3) شیخین، اس میں جمال الدین افغانی کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے نبوت کو کسبی مانا ہے، (ص28) یہ بنیادی طور پر اسلام کی جڑوں پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے، اس کے بارے میں ضروری تھا کہ تفصیلات مہیا کی جاتیں۔ اسی طرح جمال الدین افغانی کے بارے میں خلاصہ کلام میں مذکور ہے کہ اقبالؒ بلاشبہ ایک مفکر امت مسلمہ کا درد رکھنے والے اور مصلح تھے، لیکن ان کے بعض نظریات اور افکار امتِ مسلمہ کے متفق علیہ عقائد کے منافی تھے (ص32) اس کے لیے ضروری تھا کہ علامہ اقبالؒ پر برصغیر کے تناظر میں ایک پورا مضمون لکھا جاتا تاکہ عامۃ الناس کو ان کے متجددانہ نظریات سے آگاہی میسر آتی۔ مصر کے جن لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ان میں ادیبوں کو بھی شامل کر لیا گیا، اگر صرف مذہب کے حوالے س کام تک محدود رکھا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔ اور ایک اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ جن مصری متجددین کا تذکرہ کیا گیا، اس بارے میں آگاہ کیا جاتا کہ ان کے نظریات وافکار کو موجودہ مصر میں کتنی اہمیت حاصل ہے یا تجدد کی ذمہ داری جامعۃ الازہر نے سنبھال لی ہے؟

ترکی کی تحریک تجدد کے ذکر کے ذیل میں صرف ایک مصطفیٰ کمال پاشا کا تذکرہ کیا گیا حالانکہ یہ علاقہ تجدد پسندی کے حوالے سے کافی معروف رہا، دیگر متجددین کا تذکرہ بھی ضروری تھا، جن کے طرف ابوالحسن ندویؒ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا تھا۔ اگر کتاب کی ضخامت کا خدشہ تھا تو ایک صفحہ مختص کر دیا جاتا تاکہ ایک اجمالی خاکہ سامنے آجاتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بہت ضروری تھی کہ موجودہ دور میں ترکی معاشرے میں تجددپسندانہ نظریات کس طرح کارگر ہیں؟ اور روایتی مسلم علمی دنیا ان کے خلاف کس طرح جدوجہد کر رہی ہے؟ اور ان کے ایک معروف ادارے "دیانت" کا تعارف بھی کروایا جاتا۔

برصغیر کے تناظر میں صرف تین لوگوں کا انتخاب کیا گیا، جن میں سر سید احمد خان، علامہ پرویز اور ڈاکٹر طاہر القادری شامل ہیں، زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پچھلے دنوں سوشل میڈیا پر ایک کتاب بعنوان: برصغیر کے متجددین نظر آئی جو حال ہی میں لکھی گئی ہے جو مفتی فضل الرحمن نے لکھی جو ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے پہاڑپور میں واقع دارالشیبانی للافتاء

والتحقیق کے نگران ہیں، انہوں نے برصغیر کے 27 متجددین کے بارے میں تفصیل سے لکھا، یہ کتاب 649 صفحات پر مشتمل ہے، ان کو جو بھی اہل سنت والجماعت سے کسی پہلو سے اختلاف کرتے ہوئے نظر آیا، انہوں نے اسے تجدد کا چولا پہنا دیا۔ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر صاحب اپنی کتاب کی ضخامت میں اضافہ کر دیتے اور سید امیر علی، فضل الرحمان، شبلی نعمانی، وحید الدین خان، اور جاوید احمد غامدی کا تذکرہ بھی ہو جاتا جن سے یہ معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کس کس پہلو سے مسلم علمی روایت سے انحراف کیا۔

کتاب کے عنوانات کے تحت بھرپور محنت کی گئی ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں درج ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈال دی جائے تو کتاب کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہو جائے گا۔

- تجدد، تجدید، تسامحات تفردات اور انحراف جیسی اصطلاحات مستقل مضمون کی متقاضی تھیں
- علماء فتویٰ کو قرآن وسنت کی روشنی میں دیتے ہیں اور ان کے فتاویٰ کے کمزور پہلوؤں کو واضح کیا جاتا
- اگر موضوعات کا انتخاب کر لیا جاتا مثلاً سنت وحدیث کے بارے میں رائے، عورت کے سماجی کردار، موسیقی کی شرعی حیثیت، سود یا اسلامی بنکاری کی شرعی حیثیت، اسلام کا ثقافتی اور سیاسی پہلو وغیرہ۔ ان جیسے موضوعات پر ان کے مطالعات پیش کیے جاتے اور ان کا محاکمہ قرآن وسنت کی روشنی میں کیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔
- چاہے متجددین ہوں یا روایتی علماء، سب نے قرآن وسنت کی پیروی کرنے کی کوشش کی یا اختلاف کی صورت میں تعبیر کی کوشش کی، اگر اس پہلو کو اجاگر کیا جاتا تو عامۃ الناس کو اس معاملے میں بہتر رہنمائی میسر آتی

کیا فتویٰ میں اختلاف یا دین کی تعبیر میں اختلاف کے موضوع پر کسی کو تجدد کا چولا پہنا دینا درست عمل ہے؟

- علامہ اقبالؒ ہماری فکری تاریخ کا اہم ترین فرد خیال کیا جاتا ہے، اس کو بھی متجدد کے طور پر شمار کیا جاتا ہے (دیکھیے: ص32)
- برصغیر کی تجدد پسندانہ تحریک کے تناظر میں علامہ پرویز کو بھی شامل کیا گیا، اس میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ جن علماء نے ان کے کفر پر اجماع ہونے پر دستخط کیے، اس اجماع کو معاشرتی سطح پر کیوں نہ لاگو کیا گیا، اور معاشرتی سطح پر بھی وہ ردعمل سامنے نہ آیا جس طرح قادیانی مذہب کے حوالے سے منظر عام پر آیا اور پارلیمان نے اس

پر اجماع بھی کیا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'فتنہ پرویزیت' کے خلاف فتویٰ اور اجماع میں جان نہ تھی یا کوئی مسئلہ درپیش تھا جس کی وجہ سے ان کے خلاف کفر کے فتویٰ کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

- بہت ضروری تھا کہ تجدد اور تجدید کی تعریفات کے بعد مصنف عہدِ حاضر کے مجدد کا تذکرہ کرتے تاکہ لوگ اپنی آخرت کی بہتری کے لیے اسی پر اعتماد کرتے، اور دنیاوی معاملات کے بارے میں اسی کے فتاویٰ پر عمل کرتے یا کسی ایسے ادارے کا واضح الفاظ میں بیان کرتے جو ان کے خیال میں قرآن و سنت کا متبع ہے اور اسی کے فتاویٰ اقرب الی القرآن والسنۃ ہیں۔

دارالبصیرۃ کی ایک خوبصورت پیشکش ہے، پروف ریڈنگ بہت احتیاط کی گئ ہے، اعلیٰ کوالٹی کا صفحہ استعمال کیا گیا ہے، اس کے علاوہ جلدی بندی بھی خوبصورت کی گئی ہے۔ اس کتاب کو ہر اس اسکالر اور طالبعلم کے پاس ضرور موجود ہونی چاہیے جو جدید فکری تحریکوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے یا جو اسی میدان میں اپنی علمی سرگرمیوں میں مشغول ہے۔ ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی سطح کے طلباء کو تحریک جدیدیت کے اجمالی مطالعے کے لیے اس کو ضرور دیکھنا چاہیے۔

بانی:ڈاکٹر حافظ سعید احمد

Institute Of Orientalism

انسٹی ٹیوٹ آف اور ینٹلزم میانوالی کی بنیاد 31 جولائی 2022ء بمطابق یکم محرم 1444ھ کو رکھی گئی۔ مذکورہ ادارہ ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے، جس کے قیام کے بنیادی مقاصد میں درج نکات شامل ہیں:

(1) اسلام کے بارے میں مستشرقین کی تحقیقات کو اردو زبان میں بیان کرنا

(2) استشراق پر مسلم محققین اور اسکالرز کی گئی تحقیق کی ترویج و اشاعت کے لیے اردو میں ترجمہ کرنا

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے ادارہ اردو میں استشراق کے بارے میں لکھی گئی کتب اور مقالہ جات کی اشاعت کا اہتمام کرے گا، اور مسلم محققین اور مستشرقین کے اسلام کے بارے میں انگریزی زبان میں لکھے گئے تحقیقی مقالہ جات، کتب اور مضامین کے تراجم کروائے گا اور ان کو شائع کرے گا، ان تراجم کی اشاعت اور مغربی اداروں کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کو اردو زبان میں بیان کرنے کے لیے ایک رسالہ شائع کیا جائے گا، اس کے علاوہ ادارہ اپنے مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کانفرنسز اور سیمینار کا انعقاد کروائے گا تاکہ مسلم معاشرے میں علمی مباحث کو نئے زاویے میسر آسکیں۔ اور مغرب کی اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کا تدارک ہو سکے اور ان کے پیش کردہ مفید علمی نکات سے استفادہ کیا جا سکے۔

Institute Of Orientalism

Email: ioorientalism@gmail.com